ISBN 978-969-9266-04-1

ماہنامہ معارفِ رضا کراچی

جلد: 32 | شمارہ: 11

نومبر ۲۰۱۲ء / ذی الحجۃ ۱۴۳۳ھ

حُسنِ ترتیب (شمارہ نومبر ۲۰۱۲ء)

ہدیہ فی شمارہ: 40 روپے
سالانہ: عام ڈاک سے: -/400 روپے رجسٹرڈ ڈاک سے: -/800 روپے
بیرونِ ممالک: 40 امریکی ڈالر سالانہ

نوٹ: رقم دستی یا منی آرڈر / بینک ڈرافٹ بنام "ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا" ارسال کریں، چیک قابلِ قبول نہیں۔
ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر: کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 45-5214۔ حبیب بینک لمیٹڈ، پریڈی اسٹریٹ برانچ، کراچی۔

نوٹ: ادارتی بورڈ کا مراسلہ نگار / مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ﴿ادارہ﴾

ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا

25-جاپان مینشن، ریگل، صدر، جی پی او صدر، کراچی-74400، اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ فون: 32725150-21-92+ فیکس: 32732369-21-92+

ای میل: imamahmadraza@gmail.com، ویب سائٹ: www.imamahmadraza.net

اپنی بات

حج اور تصوّف

پروفیسر دلاور خاں

اسلامی عبادات کا فلسفہ ایسے انسان کی تشکیل کرنا جو اللہ تعالیٰ اور مصطفیٰ کریم ﷺ کی تفویض کی ہوئی ذمّے داریوں کو پورا کرے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی مطلوب صفات پیدا کرتی ہے، روحانی اور اخلاقی بلندیوں پر پہنچاتی ہے۔ عبادات کا اصل مقصد تو تزکیۂ نفس اور تقویٰ کی روح پیدا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار ہو۔ نفس کی اصلاح کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

حج کے مناسک پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز اور عمل سے بندگی کا تصور نمایاں ہوتا ہے۔ لباس کی تبدیلی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے فقیری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ گویا ایک گدا جھولی پھیلائے یا ایک جاں نثار سر فروشی کے لیے میدان جہاد کی طرف جارہا ہے۔ احرام پہننے کے بعد وطنی لباس کی تفریق ختم ہو جاتی ہے کیوں کہ سب ہی ایک قسم کا لباس زیب تن کرتے ہوئے اسلامی قومیت کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ تمام تفریقوں کو مٹا کر اسلام کے رشتے میں جڑتے ہیں۔ طواف کرتے ہوئے حاجی مردے کا کفن پہنے ہوئے بارگاہِ خداوندی میں عجز و انکساری کے ساتھ بخشش کے طالب اور اس کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے جس سے میدان حشر کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا تم کہاں سے آتے ہو؟ اس شخص نے کہا کہ حضور حج کر کے آیا ہوں۔ حضرت جنید نے فرمایا تم حج کر کے آتے ہو؟ اس نے عرض کیا جی ہاں! اس کے بعد آپ نے اس سے یہ سوالات کیے:

حضرت جنید: جب تم بہ نیّتِ حج گھر سے نکلے اور اپنے وطن کو چھوڑا تو کیا اس وقت سب گناہوں کو چھوڑا یا نہیں؟

حاجی: حضور! یہ تو نہیں کیا۔

حضرت جنید: تو پھر تم گھر سے چلے ہی نہیں۔ آپ نے مزید دریافت کیا، اچھا جب تم گھر سے چلے اور منزل پر قیام کیا تو راہِ حق یعنی طریقت کا مقام بھی طے کیا یا نہیں؟

حاجی: حضور! مجھے اس کی خبر نہیں تھی۔

حضرت جنید: تو پھر تم نے منزلیں بھی طے نہیں کیں۔ آپ نے مزید دریافت کیا: اچھا جب تم نے احرام باندھا تھا تو میقات میں صفاتِ بشریت سے علیحدگی کی جس طرح کپڑے اور عادات سے علیحدگی کی تھی۔

حاجی: حضور! یہ بھی نہیں ہوا۔

حضرت جنید: تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ تم نے احرام بھی نہیں باندھا۔ اچھا جب تم عرفات میں کھڑے ہوئے تو تمہیں کشف و مشاہدہ کا فرق واضح ہوا؟

حاجی: حضور! یہ بھی نہیں۔

حضرت جنید: تو گویا تم عرفات میں بھی کھڑے نہیں ہوئے۔ اچھا تم مزدلفہ پہنچے تو تم نے نفسانی مرادیں ترک کیں؟

حاجی: حضور! نہیں۔

حضرت جنید: گویا تم مزدلفہ بھی نہیں گئے۔ اچھا جب تم نے طوافِ بیت اللہ کیا تو بہ چشم سر تنزیہ کے مقام میں لطائفہ جمالِ حق دیکھے؟

حاجی: حضور! نہیں دیکھا۔

حضرت جنید: تو گویا تم نے طواف بھی نہیں کیا۔ اچھا تو یہ بتاؤ جب تم نے صفا و مروہ کی سعی کی تو تمہیں صفا کا مقام اور راہ حق پر گذرے کا درجہ معلوم ہوا۔

حاجی: حضور! مجھے اس کی تمیز ہی نہیں تھی۔

حضرت جنید: تو تم نے ابھی سعیِ صفا و مرہ بھی نہیں کی۔ اچھا جب تم منیٰ میں پہنچے تو تمہاری ہستی تم سے ساقط ہوئی؟

حاجی: نہیں!

حضرت جنید: تو گویا تم منیٰ بھی نہیں گئے۔ اچھا! جب تم قربان گاہ پہنچے تو قربانی کی۔ کیا تم نے خواہشاتِ نفسانیہ کو قربان کیا؟

حاجی: حضور! ایسا نہیں۔

(بقیہ صفحہ نمبر 24 پر ملاحظہ فرمائیں)

کنزالایمان اور ڈاکٹر اوج کا مقالہ

چوتھی قسط

پروفیسر دلاور خاں

پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز کراچی یونیورسٹی کے ڈین کے منصب پر فائز ہیں۔ آپ نے پروفیسر ڈاکٹر اختر سعید صدیقی کی زیر نگرانی مقالہ "قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ" مکمل کرکے ۲۰۰۵ء میں پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ موصوف کے مقالے میں مفکر اسلام امام سوادِ اعظم اہلِ سنّت احمد رضا خاں محدث حنفی قادری برکاتی کا شہرۂ آفاق ترجمۂ قرآن "کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن" شامل ہے۔ مقالے کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اوج کنزالایمان کے فنی، علمی محاسن کی گیرائی اور گہرائی سے قلتِ علم کی وجہ سے نابلد رہے ہیں، جس سے اہلِ علم میں اس مقالے کی ثقاہت اور صاحب مقالہ کی علمی ساخت متاثر ہوئی۔ انصاف اور تحقیق کے تقاضوں کے تحت ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کے جوائنٹ سیکریٹری پروفیسر دلاور خاں زید مجدہ نے مذکورہ مقالے کا معروضی انداز سے مطالعہ کیا ہے اور مقالے میں پائے جانے والے اصولِ تحقیق سے انحراف اور غیر متوازن پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ کنزالایمان کے محاسن کسی مصلحت کی نذر ہو گئے تھے اس پر علمی اور فنی پہلوؤں سے گفتگو کی ہے، جسے قسط وار شائع کیا جارہا ہے تاکہ موصوف نے جو زیادتی کنزالایمان سے اپنے مقالے میں جہاں جہاں برتی ہے تحقیقی انداز میں اس کا ازالہ ہوسکے اور ان سات تراجم پر کنزالایمان کی علمی وفنی برتری ثابت ہو۔ یہ کوئی مجادلہ اور مناظرہ نہیں بلکہ علمی بحث ہے، جس کا آغاز خود ڈاکٹر اوج نے اپنے مقالے کی اشاعت سے کیا ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر اوج اپنا موقف پیش کرنا چاہیں تو ہم معارفِ رضا میں انہیں خوش آمدید کہیں گے۔ (سید وجاہت رسول قادری، مدیر اعلیٰ معارفِ رضا)

کنزالایمان اور منتخب تراجم آیات کا تقابلی مطالعہ

النبا/۷۸

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ○ (۴۔۵)

۱۔ ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا۔ ہاں ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا۔(مودودی)

۲۔ ہرگز نہیں، اب جان لیں گے، پھر بھی ہرگز نہیں، اب جان لیں گے۔(محمود الحسن)

۳۔ ہرگز ایسا نہیں (کہ قیامت نہ آئے گی) ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے، اور پھر ہرگز ایسا (کہ قیامت نہ آئے گی) انہیں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔(عبدالماجد)

۴۔ ان کو اصل حال معلوم ہوجائے گا۔ پھر ضرور جان لیں گے۔ (ثناءاللہ)

(۵) یقیناً وہ جلد جان جائیں گے۔ ہاں بالیقین وہ عنقریب ہی جان جائیں گے۔(ابو منصور)

(۶) ہرگز ایسا نہیں، وہ عنقریب جان لیں گے۔ پھر ہرگز نہیں، وہ جلد جان جائیں گے۔(امین احسن اصلاحی)

(۷) ہاں ہاں! اب جان جائیں گے۔ پھر ہاں ہاں، جان جائیں گے۔(احمد رضا)

(۸) یقیناً وہ اسے جان لیں گے۔ پھر یقیناً وہ اسے جان لیں گے (کہ قیامت برحق ہے)۔ (کرم شاہ الازہری)

"مذکورہ بالا تراجم میں محمد کرم شاہ الازہری، احمد رضا بریلوی اور ابو منصور کے سوا دیگر مترجمین نے "کلا" کا ترجمہ بمعنیٰ "ہرگز نہیں" یا "ایسا نہیں" سے کیا ہے۔۔۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کلا کا معنی بجائے نفی کے اثبات میں کیا جائے، جیسا کہ الازہری، بریلوی اور ابو منصور نے کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ مذکورہ بالا تراجم میں "سیعلمون" کا مفعول فقط کرم شاہ الازہری اور عبدالماجد دریابادی نے وجوبِ قیامت سے متعین کیا ہے جب کہ دیگر کے تراجم اس وصف سے خالی ہیں۔ بہر حال ان ہر دو آیات کا زیادہ مناسب اور جامع ترجمہ محمد کرم شاہ الازہری کا قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے ترجمے میں دونوں طرح کے حسن سمیٹ لیے ہیں۔ اوّلاً لفظ کلاّ کے معنیٰ کا استعمال۔ ثانیاً ترجمے میں لفظ سیعلمون کا حذف کھولنا، تاکہ وہ بھرپور معنویت کا حامل ہوسکے۔ (م،الف: ۱۴۲)

تبصرہ:

(الف) "کلا" کے اثباتی تراجم میں کسی ترجمے کو دیگر پہلو سے کوئی فوقیت حاصل ہے یا نہیں اس حقیقت کا مزید مطالعہ کرتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کلا "سیعلمون ثم کلا سیعلمون" کے بارے میں رقم طراز ہیں "زور و جوش کے موقع پر، فقروں کی یہ تکرار عربی حسن خطابت اور اسلوب بلاغت کا ایک خاص نمونہ ہے۔ اردو محاورہ میں بھی توزور وجوش کے موقع پر کہتے ہیں "اجی یہ دیکھیں گے، اور پھر دیکھیں گے (م،الف، ص ۱۴۳)

اس پس منظر میں جب مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ترجمہ عربی حسن خطابت اور اسلوب بلاغت کو اپنے دامن میں سمیٹے دکھائی دیتا اس طرح "کلا" کے "اثباتی" تراجم میں مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

(ب) ان آیات کے دوسرے پہلو سے ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری، مولانا احمد رضا خاں اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے تراجم کا مطالعہ کرتے ہیں اول الذکر مترجم کے ترجمے میں "سین" کا ترجمہ مفقود ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں "السین(س) یہ حرف ہے اور اس کا دخول مضارع کے لیے خاص ہے اور جب یہ مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اس کو خالص مستقبل کے معنٰی میں کر دیتا ہے۔۔۔ نحویانِ بصرہ اس طرف گئے ہیں "سَوفَ" کے ساتھ مقابلے میں اگر فعل مضارع "سین" کے ساتھ آئے تو اس میں بہ نسبت "سوف" کے مستقبل کی مدت زیادہ تنگ (کم وسیع) ہوتی ہے (الاتقان حصہ اول، ص ۵۱۸) یعنی اس میں زمانہ مستقبل قریب کا معنٰی پایا جاتا ہے "سین" کی اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری کے ترجمے میں زمانہ مستقبل قریب مفقود ہے۔

(۲) مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمے میں زمانہ حال پایا جاتا ہے جب کہ "سین" مضارع پر داخل ہوتا ہے تو زمانہ مستقبل قریب کا معنٰی دیتا ہے جو یہاں مفقود ہے۔

(۳) مولانا احمد رضا خاں کے "سیعلمون" کے ترجمے "اب جان جائیں گے" میں علم النحو کے اعتبار سے "سین" مضارع پر داخل ہو تو زمانہ مستقبل قریب کا معنٰی دیتا ہے۔ اس لحاظ سے انہوں نے ترجمہ مستقبل قریب کے تحت "اب جان جائیں گے" کے تحت ترجمہ کیا ہے جو علم النحو کے عین مطابق ہے۔ اس پہلو سے بھی مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کو ان دونوں تراجم پر فوقیت حاصل ہے۔

(ج) تیسرے پہلو سے ان تراجم کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ڈاکٹر اوج نے ان تراجم کو محض اس لیے بھرپور معنویت کا حامل قرار دیا کہ انہوں نے وجوب قیامت سے سیعلمون کا حذف کھولا ہے جبکہ آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا ترجمہ وجوب قیامت سے متعین کیا جائے۔ دوسری طرف ڈاکٹر اوج کا فکری انتشار وتضاد بھی ملاحظہ ہو کہ جب مترجمین نے آیات میں حذف کو کھولا تو ڈاکٹر اوج نے محض ان تراجم کو اپنی ترجیح سے اس لیے خارج کر دیا کہ انہوں نے حذف کھول کر زائد الفاظ سے ترجمہ کیا جو آیت کے کسی الفاظ کا ترجمہ نہیں تھے۔

ڈاکٹر اوج لکھتے ہیں کہ (النباء:۱۲) میں عام طور پر مترجمین نے اس کا ترجمہ لفظ آسمان کے اضافے کے ساتھ کیا ہے (یعنی انہوں نے حذف کھولا) حالانکہ اس آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا ترجمہ "آسمان" کیا جائے۔۔۔ البتہ احمد رضا، محمود الحسن اور ابو منصور نے اس آیت کا ترجمہ بغیر (حذف کھولے) آسمان سے کیا اور خوب کیا۔ اسی قسم کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

موصوف التکویر کی آیت ۱۵، ۱۶ کے تراجم کے حوالے سے لکھتے ہیں مذکورہ بالا تراجم میں محمود الحسن اور احمد رضا کے ترجموں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں نے اپنے اپنے ترجمے میں ستاروں یا سیاروں کو شامل نہیں کیا ظاہر ہے آیت میں ایسا کوئی لفظ بھی نہیں جس کا ترجمہ ستاروں یا سیاروں سے کیا جائے۔ (م،الف: ص ۱۵۳)

ڈاکٹر اوج کی ان تحقیقات سے فکری تضاد ظاہر ہو رہا ہے۔ ایک طرف ایسے تراجم کو معنویت کا حامل قرار دے رہیں جس میں (وجوب قیامت سے) حذف کو کھولا گیا ہے تو دوسری طرف ان تراجم کو اپنی ترجیح سے خارج کر رہے ہیں جس میں "آسمان اور ستاروں" سے حذف کو کھولا گیا ہے ڈاکٹر صاحب خود اولوالعزمی کے اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہیں جہاں اپنی تحقیقات کی خود ہی تردید

کر کے فخر محسوس کر رہے ہیں۔ موصوف کی اس ذہنی و علمی کیفیت کو کیا نام دیا جاسکتا ہے؟

ڈاکٹر اوج نے "وجوبِ قیامت" سے حذف کھولنے والے تراجم کو ترجیح دی ہے، جس سے آیت کے کثیر الجہت معنیٰ محدود ہو کر رہ گئے۔ اس آیت کے وسیع معنیٰ علامہ غلام رسول سعیدی یوں بیان کرتے ہیں:

(۱) پہلی آیت کا تعلق کفّار سے ہے اور دوسری آیت کا تعلق مؤمنین سے ہے یعنی عنقریب کفّار کو اس عظیم خبر کی تکذیب کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا اور عنقریب مؤمنین کو اس عظیم خبر کی تصدیق کا انجام اور جزا کا علم ہو جائے گا۔

(۲) پہلے جملہ کا معنیٰ یہ ہے: کہ عنقریب کفّار میدانِ حشر کا مشاہدہ کرلیں گے اور دوسرے جملہ کا معنیٰ ہے عنقریب کفّار اس تکذیب کے عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے۔

(۳) پہلے جملہ کا معنیٰ ہے عنقریب کفار کو معلوم ہو جائے گا اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیا کرنے والا ہے اور دوسرے جملہ کا معنیٰ ہے: عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا یہ گمان اور وہم صحیح نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔

(۴) پہلے جملہ میں میں وعید ہے اس کا تعلق دنیا کی وعید سے ہے جیسے کفّارِ مکہ کو جنگ میں شکست اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے ستر آدمی مارے گئے تھے اور ستر آدمی قید ہوئے اور دوسرے جملہ میں جو وعید ہے اس کا تعلق آخرت کی سزا سے ہے۔

(۵) پہلے جملہ میں جو وعید ہے اس کا تعلق کافروں کی موت، نزع کی سختی اور سکرات الموت سے ہے اور دوسرے جملہ میں وعید کا تعلق دوزخ کی سزا سے ہے۔

(۶) پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی تصدیق نہ کرنے پر عذاب کی وعید ہے اور دوسرے جملہ میں احکام شرعیہ فرعیہ پر عمل نہ کرنے کی بنا پر وعید ہے۔

(۷) پہلے جملہ میں جسمانی عذاب کی وعید سے جو عذاب ان کو دوزخ میں دیا جائے گا اور دوسرے جملہ میں روحانی عذاب کی وعید لیے جو مومنوں پر انعام و کرام اور ان کی تعظیم و تکریم کو دیکھا نہیں ہو گا اور دنیا میں جن کو حقیر سمجھتے تھے آخرت میں ان کی توقیر دیکھ کر ان کے دِل جلیں گے (تبیان القرآن، جلد ۱۲، ص ۵۰۷)

مولانا احمد رضا کے ترجمے کے امتیازات:

(۱) "کلّا"، نفی کی بجائے اثبات سے کیا گیا ہے۔

(۲) ترجمۂ "کلّا" عربی حسنِ خطابت اور اسلوبِ بلاغت کا عکاس ہے۔

(۳) سیعلمون کا ترجمہ زمانۂ مستقبل قریب سے کیا گیا ہے جو علم النحو کے عین مطابق ہے۔

(۴) آیت کا حذف نہیں کھول کر اس کے معنیٰ میں وسعت دی گئی ہے۔

مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کے ان امتیازات کے تحت ڈاکٹر اوج کا دعویٰ ترجیح و تحقیق مجروح ہو جاتا ہے، جس میں مولانا احمد رضا کے ترجمے کو جزوی ترجیح دی گئی تھی جبکہ امتیازات سے مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کو باقی سات تراجم پر کامل برتری حاصل ہے۔

النبا/۷۸

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ○ (۱۲)

عام طور پر مترجمین نے اس کا ترجمہ لفظ آسمان کے اضافے کے ساتھ کیا ہے حالانکہ اس آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں کہ جس کا ترجمہ "آسمان" کیا جائے۔ تاہم یہاں (ان آیات میں) جو صفات مذکور ہیں ان سے مراد آسمان ہی ہے۔ اسی لیے بیشتر مترجمین نے اسی رعایت میں ترجمہ کیا ہے اور اصلاحی صاحب کا ترجمہ بھی چونکہ اسی رعایت میں ہے اس لیے یقیناً مبنی بر صائب ہے۔

البتہ احمد رضا، محمود الحسن اور ابو منصور نے اس آیت کا ترجمہ بغیر لفظ آسمان کے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ علی الترتیب ملاحظہ ہو:

اور تمہارے اوپر سات مضبوط چنائیاں چنیں۔ (احمد رضا)

اور چنی ہم نے تم سے اوپر سات چنائی مضبوط (محمود الحسن)

اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط (مدار) بنائے (ابو منصور) (م، الف: ۱۵۰)

تبصرہ:

(الف) ڈاکٹر اوج کو اس مرحلے پر ان تین تراجم میں بھی کسی ایک کی ترجیح قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی تاکہ تحقیق کے تقاضے پورے ہوتے۔ ان تینوں تراجم کا ایک بار پھر مطالعہ کرتے ہیں آیا ان

تراجم میں سو فیصد مماثلت پائی جاتی ہے یا کسی ترجمے کو فوقیت حاصل ہے۔ سب سے پہلے ابو منصور کے ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں "مدار" کا اضافی ترجمہ ہے جبکہ ڈاکٹر اوج نے اسی آیت کے تحت "آسمان" کے اضافی تراجم کو اپنی ترجیح سے خارج کر دیا۔ موصوف کے اصول کے مطابق "مدار" کے اضافی ترجمے کو ترجیح سے خارج ہونا چاہیے تھا جو کہ نہیں کیا گیا۔

(ب) آخر میں مولانا احمد رضا خاں اور مولانا محمود الحسن کے تراجم بچے۔ کیا ان تراجم میں کسی ایک کو ترجیح حاصل ہے یا دونوں ترجمے برابر ہیں؟ ان کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے "سات مضبوط چنائیاں" اور مولانا محمود الحسن نے "سات چنائی"۔ دوسرے الفاظ میں مولانا احمد رضا خاں نے جمع کے لیے جمع استعمال کیا ہے جبکہ مولانا محمود الحسن نے جمع کے لیے واحد استعمال کیا ہے۔ اس پہلو سے مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کو مولانا محمود الحسن کے ترجمے کو دیگر چھ تراجم پر فوقیت حاصل ہے۔

جبکہ ڈاکٹر اوج اپنی تحقیق سے ابو منصور اور مولانا محمود الحسن کے تراجم کو مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کے برابر قرار دے کر تحقیقی اصولوں سے انحراف کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔

التکویر ر ۸۱

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ o الْجَوَارِ الْكُنَّسِ o وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ o وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ o (۱۵ تا ۱۸)

۱۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے۔ (اصلاحی)

۲۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں۔ پلٹنے اور چھپ جانے والے تاروں کی اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہوئی اور صبح کی جب کہ اس نے سانس لیا۔ (مودودی)

۳۔ پس میں قسم کھاتا ہوں، چھپ چھپ کر چلنے والے سیاروں کی اور قسم ہے رات کی، جب وہ خوب تاریک ہو جاتی ہے اور قسم ہے دن کی، جب وہ خوب روشن ہو تا ہے۔ (ثناءاللہ)

۴۔ پس میں قسم کھاتا ہوں، پیچھے ہٹ جانے والے، طلوع و غروب ہونے والے ستاروں کی اور رات کی جب وہ خوب تاریک ہو جاتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی (نمودار ہوتی) ہے۔ (ابو منصور)

۵۔ سو قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانے والوں، سیدھے چلنے والوں، دبک جانے والوں کی اور رات کی جب پھیل جائے اور صبح کی جب دم بھرے۔ (محمود الحسن)

۶۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ پیچھے ہٹنے والے (ستاروں) کی، چلتے رہنے والوں، جا چھپنے والوں کی اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے اور صبح کی جب وہ آنے لگے۔ (عبدالماجد)

۷۔ پھر میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے تاروں کی (اور قسم کھاتا ہوں) سیدھے چلنے والے، رک کے رہنے والے تاروں کی اور رات کی جب وہ رخصت ہونے لگے اور صبح کی جب وہ سانس لے۔ (محمد کرم شاہ الازہری)

۸۔ تو قسم ہے ان کی جو الٹے پھریں۔ سیدھے چلیں، تھم رہیں اور رات کی جب پیٹھ دے اور صبح کی جب دم لے۔ (احمد رضا)

"مذکورہ بالا تراجم میں محمود الحسن اور احمد رضا کے ترجموں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں نے اپنے اپنے ترجمے میں لفظ ستاروں یا سیاروں کو شامل نہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آیت میں ایسا کوئی لفظ بھی نہیں ہے جس کا ترجمہ ستاروں یا سیاروں سے کیا جائے۔ چنانچہ ان دونوں نے اپنے ترجموں میں اس امر کا لحاظ رکھا ہے۔ تاہم ان میں ایک فرق ضرور پایا جاتا ہے اور وہ ہے "والیل اذا عسعس" کا ترجمہ۔ احمد رضا نے اس کا معنیٰ پیٹھ دینے یعنی پیچھے ہٹنے سے کیا ہے جب کہ محمود الحسن نے اس کا معنیٰ پھیل جانے سے کیا ہے۔

بہر کیف مذکورہ بالا تراجم میں احمد رضا اور محمود الحسن کے تراجم قرآنی الفاظ کا اردو میں عکس لیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں میں ادب کی چاشنی اور زبان کی سلاست و روانی اور صوتی نغمگی و آہنگ احمد رضا کے ہاں زیادہ ہے۔

دوسرے پہلو سے ان تراجم میں عبدالماجد کے ترجمے میں ایک انفرادیت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے ہاں لفظ قسم کا استعمال دو مرتبہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ "اقسم" کے تحت اور دوسری مرتبہ والیل میں حرف واو (قسمیہ) کے تحت اور ایسا کرنا قرآن کے

لفظی پہلو کی نمائندگی کے عین مطابق ہے۔ بایں سبب یہ ترجمہ سب سے منفرد ہے۔

تیسرے پہلو سے دیکھا جائے تو اصلاحی اور سید مودودی کے تراجم میں ایک مشترک خصوصیت نظر آتی ہے جو لفظ "فلا" کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ ان ہر دو حضرات نے فلا کا ترجمہ "پس نہیں" سے کیا ہے۔ آیات قسم میں یہ بات محقق ہے کہ قسم سے پہلے اگر "لا" یا "فلا" اس طرح آئے، جس طرح یہاں آیا ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید اس سے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے فقط امین احسن اصلاحی اور سید مودودی کے تراجم نمایاں ہیں۔"

(م،الف: ۱۵۳، ۱۵۴)

تبصرہ:

ڈاکٹر اوج آیت کے ایک پہلو سے مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "تاہم ان دونوں میں ادب کی چاشنی اور زبان کی سلاست و روانی اور صوتی نغمگی و آہنگ احمد رضا کے ہاں زیادہ۔" (ص۱۵۳)

موصوف نے مولانا احمد رضا کی ترجیح کا دعویٰ کیا ہے، لیکن اسے دلائل سے ثابت نہیں کیا جو اصولِ تحقیق کے خلاف ہے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے چند دلائل ملاحظہ ہوں:

نثر کی متعدد اقسام میں ایک "نثر مسجع" بھی ہے جس میں بحر نہیں ہوتی مگر قافیے کی پابندی کی جاتی ہے مذکورہ آیات کی ابتدائی دو آیات "نثر مسجع" کا حسین مرقّع ہیں جن کے آخر میں "الخنس" اور "الکنس" کا قافیہ پایا جاتا ہے جس سے آیت میں صوتی نغمگی و آہنگ کی چاشنی نمایاں ہورہی ہے۔ ان آیات کا ترجمہ اس اسلوب کا متقاضی ہے کہ وہ بھی مسجع پیرائے میں ہو۔ اس تناظر میں صرف مولانا احمد رضا نے مسجع آیت کا مسجع ترجمہ ہی قلم بند کیا۔ ملاحظہ ہو "الٹے پھریں سیدھے چلیں" میں قافیہ بندی کی گئی ہے جس کی وجہ سے ترجمے میں صوتی نغمگی و آہنگ کی جھلک آشکار ہورہی۔ قرآن کے اسلوبِ بلاغت کو ترجمے کے قالب میں ڈھال دینا ہر کس و ناکس کی بات نہیں۔ اسی لیے مولانا احمد رضا کا ترجمہ یہاں منفرد نظر آتا ہے۔

ادبی پہلو کی ایک اور جہت سے اس ترجمے کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا ان میں محاورات کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً الٹے پھرنا پیٹھ دینا اور دم لینا۔ ان محاورات کے استعمال سے الفاظ کے معنیٰ بھی ہوگئے اور عبارت کا تسلسل بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ آپ نے الفاظ اور محاورے کے حسین امتزاج سے ترجمے کے حسن کو دوبالا کردیا۔ جبکہ دیگر مترجمین اس اسلوب کو اپنے تراجم میں ڈھالنے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں۔

دوسرے پہلو سے ڈاکٹر اوج نے تراجم میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمے کو منفرد قرار دیا کیوں کہ ان کے ہاں قسم کا استعمال دومرتبہ ہوا۔ اس پہلو سے مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں:

کسی بھی ترقی یافتہ زبان اور متداول ادب میں "ایجاز مخل" اور "اطناب ممل" کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس قسم کی تخلیقات کو عیب اور مصنّف کے فنی ضعف پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس عبارت کے ایجاز و اختصار اور اس سے حاصل شدہ معانی وبیان کی جامعیت کو نہ صرف سراہا جاتا ہے بلکہ اسے مصنف کے ادبی کمال پر محمول کیا جاتا ہے۔ "خیرالکلام ماقل و دل" کہ عمدہ کلام جو مختصر مگر جامع ہو۔

مولانا احمد رضا خاں نے ترجمۂ قرآن میں ایجاز و اختصار کا التزام فرمایا۔ علامہ جلال الدین لکھتے ہیں: "کبھی محذوف کا تعین اس وجہ سے ہوجاتا ہے کہ اس کی تصریح دوسرے مقام پر موجود ہوتی ہے۔"

(الاتقان، حصۂ دوم، ص۱۸۱)

یہی صورت اس ترجمے میں ہے کہ قسم کی تصریح ترجمے کے شروع "فَلَآ اُقْسِمُ" میں موجود ہے۔ "اور رات کی جب پیٹھ دے اور صبح کی جب دم لے یہاں "رات کی" اور "صبح کی" کا مرجع "قسم" ہے۔

پس معلوم ہوا کہ مولانا احمد رضا خاں نے اس ترجمے میں ایجاز واختصار سے کام لیتے ہوئے لفظِ قسم معناً دوبار استعمال کیا ہے۔ اس طرح ان آیات کے تراجم میں "قسم" لفظاً ایک بار معناً دوبار استعمال ہوئی جو اپنے دامن میں حسنِ بلاغت سمیٹے دکھائی دیتی ہے جس سے معنیٰ بھی اچھی طرح واضح ہوگئے اور ایجاز کو بھی ملحوظ رکھا گیا نیز سلاست بھی برقرار رہی۔

ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ "قسم" کے ایجاز واختصار کے پہلو سے مولانا احمد رضا کے ترجمے کو مولانا عبد الماجد دریابادی سمیت دیگر مترجمین کے تراجم میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر اوج کی "لا" سے متعلق تحقیق ملاحظہ ہو:

"(۱) آیاتِ قسم میں یہ بات محقق ہے کہ "لا" قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید مقصود ہوتی۔

(۲) "لا اقسم" میں لا منفصل ہے "لا" منفصل در اصل مخاطب کے خیال کی تردید میں واقع ہوتا ہے۔

(۳) لا زائدہ کا مطلب یہ ہے کہ یہاں "لا" نہ ہو جب بھی وہی معنٰی ہوں گے مگر لا زائدہ سے قسم کو مؤکد کرنا مقصود ہوتا ہے۔

موصوف لکھتے ہیں "لا منفصل" اور "لا زائدہ" کی وضاحت کے بعد اس پہلو سے کسی کو ترجیح دینا امر دشوار ہے" (م، الف: ۱۸۷)

ڈاکٹر اوج نے آیات قسم میں "لا منفصل" کو ترجیح دی ہے "لا منفصل" کی ترجیح میں دلائل کا فقدان پایا جاتا ہے۔ "آیات قسم" میں "لا زائدہ" کی ترجیح میں مفسرین کے اقوال ملاحظہ ہوں:

(فلا أقسم) لا زائدة والمعنى أقسم،
(تفسیر الجامع لاحکام القرآن / القرطبي)

(فَلَآ أُقۡسِمُ) («لا» زائدة)
(تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل / النسفي)

قوله تعالىٰ: (فلا أقسم) لا زائدة، والمعنى:أقسم
(تفسیر زاد المسیر في علم التفسیر / ابن الجوزي)

قوله تعالىٰ: (فلا) إما أن تكون "لا" زائدة،
بالتفسیر المحرر الوجیز في تفسیر الكتاب العزیز / ابن عطیة (خُنَّس)

قوله عزّوجلّ: (فَلَآ أُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ)،"لا" زائدة، معناه: أقسم بالخنس،
(تفسیر معالم التنزیل / البغوي)

قوله: (فَلَآ أُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ)،أي: "أقسم" ،و "لا" زائدة كما تقدم
(تفسیر اللباب في علوم الكتاب / ابن عادل)

(لا) زائدة مؤكدة، والمعنى: أقسم بالخنس
(تفسیر تفسیر الهداية إلى بلوغ النهاية / مكي بن أبي طالب)

(فَلَآ أُقۡسِمُ) «لا» زائدة (بِالۡخُنَّسِ)
(تفسیر تفسیر القرآن الكريم / ابن كثیر)

(فَلَآ أُقۡسِمُ) لا زائدة (بِالۡخُنَّسِ)
(تفسیر تفسیر الجلالین / المحلي والسیوطي[ت المحلي])

(فَلَآ أُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ) لا زائدة،
(تفسیر فتح القدیر / الشوكاني)

(فلا أقسم)"لا " (زائدة)
(تفسیر الوجیز / الواحدي)

و معنى: (لا أقسم): إيقاع القسم، وقد عُدّت (لا) زائدة، وتقدم عند قوله تعالىٰ (في سورة الواقعة 75)۔ (فلا اقسم بمواقع النجوم)۔
(تفسیر التحریر والتنویر/ابن عاشور)
(Sourse: altafsir.com)

"لا زائدہ" کا تاکید کے ساتھ آنے کا یہ فائدہ ہے کہ وہ نفی جواب کی تمہید بن جاتا ہے۔ (الاتقان حصّۂ اوّل، ص ۵۵۵)

کسی شخص نے کسی عالم سے "لا قسم بهذا البلد" کی بابت پوچھا کہ اس کے کیا معنٰی ہیں۔۔۔۔ اس عالم نے فرمایا: "اہلِ عرب اپنے کلام کے درمیان حرف "لا" کو استعمال کرتے ہیں مگر معنٰی مراد نہیں ہوتے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی شہادت میں چند عربی شاعروں کے انکار بھی سنائے۔ (الاتقان حصّۂ دوم، ص ۹۲)

مقالے میں آیاتِ قسم مع لا زائدہ یہ ہیں:

فَلَآ أُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ (التکویر:۱۵)
فَلَآ أُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ (انشقاق:۱۶)
لَآ أُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ (البلد:۱)

ان آیاتِ تراجم میں اکثر مترجمین نے "لا زائدہ" کے تحت سادہ ترجمہ کیا ہے کہ "میں قسم کھاتا ہوں" جو قسم کو مؤکد کرنے سے

عاری ہیں جبکہ مولانا احمد رضا خاں نے ان آیات ترجمہ "لازائدہ" کے تحت کیا ہے جس میں "قسم" کو مؤکد کرنے کا رنگ نمایاں نظر آیا ہے؛ اسی لیے آیاتِ قسم میں مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کو ایک منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے۔ تراجم ملاحظہ ہوں:

(۱) تو قسم ہے ان کی جو الٹے پھریں۔
(۲) مجھے اس شہر کی قسم۔
(۳) تو مجھے قسم ہے شام کے اجالے کی۔

مولانا احمد رضا کے ترجمے کے امتیازات:

(۱) مسجع آیت کا ترجمہ مسجع ہی کیا گیا ہے۔
(۲) علم بلاغت کی صنف "ایجاز" کو خوب برتا گیا ہے۔
(۳) محاورت کا استعمال کیا گیا ہے۔
(۴) "قسم" کا استعمال لفظاً ایک بار اور معناً دو بار کیا گیا ہے۔
(۵) ترجمے میں ادب کی چاشنی، زبان کی سلاست و روانی اور صوتی نغمگی و آہنگ پایا جاتا ہے۔
(۶) "لازائدہ" کے تحت ترجمہ کر کے قسم کو مؤکد کیا گیا ہے۔

ان امتیازات کی روشنی میں مولانا احمد رضا کے ترجمے کو باقی سات تراجم پر ہر جہت سے برتری حاصل ہے۔

ڈاکٹر اوج اسے اپنی تحقیق سے جزوی ترجیح قرار دے کر حقائق سے منہ پھیر رہے ہیں۔

مطففین ۸۳/

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ o عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ o (۲۷۔۲۸)

۱۔ اور اس میں تسنیم کی ملونی ہوگی۔ ایک خاص چشمہ جس پر مقربین بیٹھ کر پئیں گے۔ (اصلاحی)

۲۔ اور اس کی ملاوٹ تسنیم کے خالص پانی سے ہوگی۔ وہ ایک چشمہ ہوگا، جس پر خدا کے مقرب بندے پانی پئیں گے۔ (ثناء اللہ)

۳۔ اور اس کی آمیزش تسنیم سے ہوگی۔ وہ چشمہ جس سے مقرب بندے پئیں گے۔ (عبد الماجد)

۴۔ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے۔ (مودودی)

۵۔ اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ یہ وہ چشمہ ہے جس سے صرف مقربین پئیں گے۔ (کرم شاہ الازہری)

۶۔ اور اس کی ملونی تسنیم سے ہے۔ وہ چشمہ جس سے مقربانِ بارگاہ پیتے ہیں۔ (احمد رضا)

۷۔ اور اس کی ملونی ہے تسنیم سے۔ وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے۔ (محمود الحسن)

۸۔ اور اس میں (آب) تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے مقربین بارگاہ ایزدی پئیں گے۔ (ابو منصور)

مذکورہ بالا تراجم میں امین احسن اصلاحی اور ثناء اللہ امرتسری کے ترجموں میں یکسانیت ہے۔ یعنی ان دونوں نے لفظ "بھا" میں ب کو بطور ظرف (یعنی جگہ) کے معنٰی میں لیا ہے۔ مطلب یہ کہ ایسی جگہ جس پر (بیٹھ کر) پئیں گے۔ جبکہ دیگر مترجمین نے اس "ب" کو بمعنٰی "سے" لیا ہے۔ یعنی ایسی جگہ جس سے نکال نکال کر پئیں گے۔

گو یہاں دونوں طرح کے ترجمے درست ہیں مگر واضح رہے کہ ظرفیت کے لیے 'ب' کا استعمال ازروئے عربیت بہت معروف ہے۔" (م، الف:۱۵۹)

تبصرہ:

اگر یہاں "ب" کو ظرفیت کے معنٰی میں لیا جائے تو چشمے پر بیٹھ کر پینا عجیب معلوم ہوتا ہے جو خلاف واقع بھی ہے، چشمے کے کنارے پر بیٹھ کر پینے کا مطلب اردو روز مرہ کے مطابق ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا "ب" کو ظرفیت کے معنٰی تک محدود کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ عربی میں "ب" کے استعمال کے معروف متعدد طریقے ہیں جو موقعہ محل کے مطابق استعمال کیے جاتے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے "ب" کے یہ معنٰی بیان کیے ہیں:

(۱) اِلصاق (۲) تعدیہ (۳) استعانت (۴) سببیت (۵) مصاحبت (۶) ظرفیت (۷) استعلا (۸) محاوزت (۹) تبعیض (۱۰) غایت (۱۱) مقابلہ (۱۲) تاکید (الاتقان حصّہ اوّل، ص ۵۰۰، ۵۰۳)

اس آیت میں "ب" کے وہ کون سے معنٰی ہیں جو حسبِ حال مراد لیے جاسکتے ہیں۔

تھوڑے فرق کے ساتھ اسی قسم کی یہ آیت ملاحظہ ہو: "عیناً یشربُ بھا عباداللہ" یہاں "المقربون" کی جگہ "عباداللہ" آیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی کے مطابق "بھا" یعنی "منھا" (اس سے) (الاتقان، حصّہ اوّل، ص ۵۰۲)

علامہ سیوطی کے مطابق مذکورہ آیت میں "ب" ظرفیت کی بجائے "من" کے معنٰی میں استعمال کرنا زیادہ معروف ہے۔

پس معلوم ہوا کہ مولانا احمد رضا خاں اور دیگر مترجمین جنھوں نے "ب" کا ترجمہ "سے" سے کیا اُن کا ترجمہ زیادہ مناسب اور برمحل بھی ہے۔

تمام مترجمین نے "یشربُ" کا ترجمہ زمانۂ مستقبل سے کیا ہے جبکہ مولانا احمد رضا خاں اور مولانا محمود الحسن نے "یشربُ" کا ترجمہ زمانۂ حال میں کیا ہے۔ دونوں مترجمین کے ترجموں کا ایک پہلو سے جائزہ لیتے ہیں:

مولانا محمود الحسن نے "المقربوں" کا ترجمہ "نزدیک والے" کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا نے "مقربوں" کا ترجمہ کیا ہے "المقربون" کا نہیں جبکہ مولانا احمد رضا خاں نے "المقربون" کا ترجمہ "مقربانِ بارگاہ" کیا ہے۔

دونوں تراجم میں فرق واضح ہے کہ مولانا محمود الحسن نے "المقربون" جو معرفہ ہے اس کا ترجمہ نکرہ کے تحت کیا جبکہ مولانا احمد رضا خاں نے "المقربون" معرفہ کا ترجمہ معرفہ ہی کے تحت کیا ہے۔

مولانا احمد رضا کے ترجمے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(ا) "ب" کا ترجمہ "من" سے کیا ہے۔
(ب) "یشربُ" کا ترجمہ زمانۂ حال میں کیا ہے۔
(ج) "المقربوں" معرفہ کا ترجمہ معرفہ کے تحت کیا ہے۔
(د) ترجمے میں ادبیت اور معنویت پائی جاتی ہے۔

اس تناظر میں مولانا احمد رضا خاں کے ترجمے کو باقی سات تراجم پر ترجیح حاصل ہے۔ ڈاکٹر اوج نہ جانے کیوں اپنی پانچ سالہ تحقیق سے مولانا اصلاحی کے ترجمے کو ترجیح دینے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

البروج ۸۵/

ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝ (۱۵)

ا۔ عظمت والے عرش کا مالک۔ (ابو منصور)
۲۔ عزت والے عرش کا مالک۔ (احمد رضا)
۳۔ عرشِ بریں کا مالک۔ (اصلاحی)
۴۔ عرش کا مالک ہے، بزرگ و برتر ہے۔ (مودودی)
۵۔ عرش کا مالک ہے، بزرگ و برتر ہے۔ (مودودی)
۶۔ عرش کا مالک ہے۔ بڑی شان والا۔ (کرم شاہ الازہری)
۷۔ مالک عرش کا، بڑی شان والا۔ (محمود الحسن)
۸۔ مالک تخت بڑی بزرگی والا۔ ثناء اللہ)

ان تراجم میں ابو منصور، احمد رضا اور اصلاحی صاحب کے تراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے "المجید" کو عرش کی صفت سمجھا ہے۔ حالانکہ المجید مرفوع ہے۔ اگر یہ عرش کی صفت ہوتا تو مرفوع ہونے کی بجائے مجرور ہوتا۔ کیونکہ اوپر والی آیت میں "المجید" مشہور قرأت کی بنا پر مرفوع ہے اور خدا کے اوصاف میں سے ہے نہ کہ مجرد اور عرش کے اوصاف میں۔" (م، الف: ۱۷۱)

پروفیسر ابو عبید دہلوی اپنے رسالے "فاضل بریلوی کے کردار و نظریات کا مختصر جائزہ" میں کنزالایمان کے اسی ترجمے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ذوالعرش المجید" احمد رضا خاں نے اس کا ترجمہ کیا ہے "عزت والے عرش کا مالک" یعنی احمد رضا خاں صاحب نے المجید کو العرش کی صفت بنایا حالانکہ المجید کی دال پر پیش کے ساتھ یہ عرش کی صفت بن ہی نہیں سکتا بلکہ ذوالعرش اور المجید دو اللہ تعالیٰ کی علیحدہ علیحدہ صفات ہیں لہٰذا صحیح ترجمہ یہ ہے "عرش کا مالک، بڑی شان والا"۔ (ص ۲۱)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اوج نے پروفیسر ابو عبید دہلوی کے اعتراض کی صحت پر کامل اعتماد کرتے ہوئے بلا تحقیق اور بغیر حوالے کے اپنے مقالے کی زینت بنایا۔ اس اعتراض کا مدلل جواب مولانا صاحبزادہ ابو الحسن واحد رضوی نے دیا کیوں کہ صاحبزادہ کی

تحقیق سے ڈاکٹر اوج کی تحقیق مجروح ہوتی اس لیے ان کے دلائل ملاحظہ ہوں:

"پروفیسر صاحب نے اعلیٰ حضرت کے ترجمے کو غلط قرار دے کر نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ آیت کا ترجمہ بالکل درست ہے۔ آئندہ سطور میں ہم دلائل وبراہین سے واضح کریں گے کہ یہ ترجمہ درست ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد بھی ہے۔

قارئین گرامی! حوالہ جات سے پہلے ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی مختلف آیات کی مختلف قرأتیں ہیں، جن کی تفصیل کتبِ تجوید و قرأت میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ مذکورہ آیت میں جہاں لفظ المجید، ذو کی صفت ہو سکتا ہے وہیں دوسری قرأت کے مطابق العرش کی صفت بھی بن سکتا ہے۔ مفسرین نے دونوں قرأتوں کا لحاظ رکھا ہے۔ کسی نے المجید کو مرفوع[دال پر پیش] پڑھ کر ذو کی صفت تسلیم کیا ہے اور کسی نے المجید کو مکسور (دال کے نیچے زیر) پڑھ کر العرش کی صفت اختیار کیا ہے۔ پہلی صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: "عرش کا مالک، بزرگی والا"، اور دوسری صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: "عزت والے عرش کا مالک"۔ امام احمد رضا نے دوسری قرأت کو اختیار کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے ان کا ترجمہ بالکل درست ہے۔ پروفیسر صاحب کا اعتراض دراصل ان کے محدود علم کا نتیجہ ہے۔ اگر انھوں نے کتبِ تفسیر اور کتبِ تجوید و قرأت کی طرف مراجعت کی ہوتی تو وہ یہ اعتراض نہ کرتے بلکہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے کہ امام احمد رضا کو دیگر علوم وفنون کی طرح علمِ قرأت پر بھی کس طرح زبردست دسترس حاصل تھی اور ترجمۂ قرآن کے اندر انھوں نے کیسی کیسی علمی بحثیں محض لفظوں میں سمو کر رکھ دی ہیں۔ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے قبل امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ جیسے عظیم مفسر نے بھی اسی قرأت کو اختیار کیا ہے بلکہ انھوں نے متنِ قرآن میں المجید کی دال پر زیر کی حرکت لگائی ہے۔ (دیکھیے تفسیر کبیر) اب ہم ذیل میں مفسرین کی توضیحات نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے المجید کو بطور صفت العرش درست قرار دیا ہے:

(۱) امام علامہ علاء الدین علی خازن علیہ الرحمۃ اپنی مشہور تفسیر "لباب التأویل فی معانی التنزیل" میں المجید کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: المجید کسرہ (زیر) کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اس بنا پر یہ العرش کی صفت ہوگا یعنی تختِ عظیم کیونکہ عرش کی صفت وعظمت بھی تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا اور کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے المجید فرما کر عرش کا حسن مراد لیا ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ عرش کا قالب تمام اجسام سے بہتر ہے۔

(۲) اسی طرح علامہ نسفی تحریر فرماتے ہیں:

"(المجید) وبالجر حمزة وعلی، علی انه صفة للعرش و مجد الله عظمته و مجد العرش علوه وعظمه" [تفسیر مدارک، ص:۳۶۷]

ترجمہ: المجید، جر کے ساتھ (بھی) ہے حمزہ اور علی (کے نزدیک) اس بنا پر عرش کی صفت ہوگا چنانچہ اللہ کی مجد وبزرگی سے مراد اس کی عظمت جبکہ عرش کی مجد وبزرگی سے مراد اُس کا اونچا اور بڑا ہونا ہے۔

(۳) صاحب تفسیر قرطبی المجید بالکسر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(ذوالعرش المجید) قرأ الکوفیون الاعاصما "المجید" بالخفض نعتا للعرش۔۔۔ الباقون بالرفع نعتا لذو وهو الله تعالیٰ واختاره أبوعبید وأبوحاتم، لأن المجد هو النهایة فی الکرم والفضل، والله سبحانه المنعوت بذلك، وان كان قد وصف عرشه بالكريم فی آخر "المؤمنون"۔۔۔" [تفسیر قرطبی، ص:۲۹۶،۲۹۷]

ترجمہ: (ذوالعرش المجید) قُرّاءِ کوفہ نے سوائے جناب عاصم کے "المجید" دال کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے، عرش کی صفت کے طور پر۔ باقی قُرّا نے رفع (دال پر پیش) کے ساتھ پڑھا ہے، ذو کی صفت کے طور پر، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس (قراءت) کو ابوعبیدہ اور ابوحاتم نے اختیار کیا ہے کیونکہ مجد کا معنیٰ ہے انتہائی کرم وفضل اور اللہ تعالیٰ اس صفت سے متصف ہے اگرچہ اُس نے اپنے عرش کو کریم بھی فرمایا ہے سورۂ مومنون کے آخر میں:

(۴) امام رازی نے اپنی "تفسیر کبیر" میں نہ صرف قرأت بالکسر کی توضیح کی ہے بلکہ اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ وہ دونوں قراءتوں

کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(المجید) وفیہ قراء تان (احداھما) الرفع فیکون ذلک صفة الله سبحانه، وھواختیار اکثر القراء والمفسرین لأن المجدمن صفات التعالیٰ والجلال، وذلک لایلیق الا بالله سبحانه، والفصل والاعتراض بین الصفة والموصوف فی ھذا النحوغیر ممتنع۔ (والقرا ةالثانیة) بالخفض وھی قراءة حمزة، والکسائی فیکون ذلک صفة للعرش، وھؤ لاء قالوا القرآن دل علیٰ انه یجوز وصف غیر الله بالمجید کما قال (بل ھوقرآن مجید) ورأنا أن الله تعالیٰ قصف العرش بأنه کریم فلا ببعید أیضاً أن یصفه بأ نه مجید، ثم قالوا ان مجدالله عظمة بحسب الوجوب الذاتی وکمال القدرة والحکمة والعلم وعظمة العرش علوه فی الجھة وعظمة مقداره وحسن صورته وترکیبه، فانه قیل العرش أحسن الأجسام ترکیباً وصورة۔ [تفسیر کبیر، ص:۱۲۳، جلد:۳۱]

ترجمہ: المجید میں دو قراء تیں ہیں ایک رفع کے ساتھ تو اس صورت میں یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو گا اور اکثر قُرّا اور مفسرین نے یہی اختیار کیا ہے کیونکہ مجد، علو اور جلال اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کو ہی سزاوار ہیں اور صفت و موصوف کے درمیان فصل ایسے مواقع میں ممنوع نہیں ہے اور دوسری قراءت زیر کے ساتھ ہے اور یہ جنابِ حمزہ اور جنابِ کسائی کی قراءت ہے تو اس صورت میں المجید عرش کی صفت ہو گا۔ ان علما و قرا کا کہنا ہے کہ قرآن میں خود اس پر دلیل موجود ہے کہ مجید اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی بھی صفت واقع ہو سکتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے "بل ھو قرآن مجید" (یہاں مجید قرآن کی صفت ہے)۔ نیز ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کو کریم فرمایا ہے تو یہ بھی بعید نہیں کہ یہاں اُس نے اپنے عرش کو مجید فرمایا ہو۔ پھر مفسرین کا کہنا ہے کہ اللہ کی مجد و بزرگی سے مراد اس کی عظمت ہے جو اس کی ذاتی ہے۔ نیز کمالِ قدرت، حکمت اور علم مراد ہے؛ جبکہ عرش کی عظمت سے مراد اُس کا جہت کے اعتبار سے بلند ہونا، مقدارِ عظمت، حسنِ صورت اور حسنِ ترکیب (بناوٹ) ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ عرش اپنی سورت و بناوٹ کے حوالے سے تمام چیزوں سے خوبصورت ہے۔

۵۔ صاحب تفسیر روح المعانی جناب شہاب الدین سید محمود آلوسی علیہ الرحمۃ بھی اسی انداز میں تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"(المجید)۔۔۔ قرأ الحسن، وعمروبن عبید، وابن وثاب، والاعمش، والمفضل عن عاصم، والاخوان المجیدِ بالجر صفة للعرش ومجده علوه وعظمته وحسن صورته وترکیبه فانه قیل العرش أحسن الأجسام صورة وترکیباً"[تفسیر روح المعانی، جلد:۳۰، ص:۹۲]

ترجمہ: (المجید)۔۔۔ حسن، عمرو بن عبید، ابن وثاب، اعمش، مفضل بروایت عاصم اور اخوان نے (المجیدِ) زیر کے ساتھ پڑھا ہے، عرش کی صفت کے طور پر (اس سے مراد) عرش کی بزرگی، بلندی، عظمت، حسنِ صورت اور خوبصورت بناوٹ ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عرش اپنی صورت و بناوٹ کے اعتبار سے تمام چیزوں سے خوبصورت ہے۔

(۶) علامہ ابن کثیر نے بھی آیت کی تفسیر میں اس بات کی صراحت فرمائی ہے اور دونوں صورتوں کو درست قرار دیا ہے، چنانچہ تفسیر ابن کثیر اردو میں ہے:

"مجید کی دو قراء تیں ہیں: دال کا پیش بھی اور دال کا زیر بھی۔ پیش کے ساتھ وہ خدا کی صفت بن جائے گا اور زیر کے ساتھ عرش کی صفت ہے۔ معنیٰ دونوں کے بالکل صحیح اور درست بیٹھتے ہیں"۔[تفسیر ابنِ کثیر، جلد ۵، ص:۴۴]

(۷) فاضل بریلوی قدس سرہ کے ترجمہ کے بعد بھی بعض مترجمین و مفسرین نے المجید کی دوسری قراءت کو پیش نظر رکھا ہے اور اسی طرح ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کے والد گرامی حضور ریاض الملت قدس سرہ نے اپنے ترجمہ ریاض الایمان میں بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ (دیکھئے تفسیر ریاض القرآن، جلد چہارم)

(۸) علاوہ ازیں ہمارے معاصر مفسر و محدث جناب علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ نے بھی اپنے ترجمۂ قرآن میں المجید کو العرش کی صفت قرار دے کر ترجمہ کیا ہے: "عظمت والے عرش کا مالک" (ملاحظہ ہو تفسیر تبیان القرآن، ص ۶۴۸، جلد ۱۲)

علامہ موصوف لفظ المجید کی توضیح میں رقم فرماتے ہیں:

''اس آیت میں مجید کا لفظ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کیونکہ تعالیٰ، مجد اور جلال، اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور اکثر مفسرین کا یہی مختار ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عرش کی صفت ہو جس طرح قرآنِ مجید (البروج:۲۱) میں مجید، قرآن کی صفت ہے''۔[ایضاً ص:۶۶]

(۹) کچھ عرصہ قبل شائع ہونے والی ایک اور اردو تفسیر، تفسیر رفاعی جو کہ جناب سید محمد رفاعی عرب کی علمی کاوش ہے، اس میں بھی آیت کا جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ المجید کی دوسری قراءت کے حوالے سے ہے، ملاحظہ ہو: ''عزت والے عرش کا مالک'' [تفسیر رفاعی، ص ۱۴۷]

(۱۰) انڈیا کے دیوبندی مصنف جناب نسیم احمد غازی مظاہری نے اپنی ''درسی تفسیر پارہ عم'' میں بھی المجید کی دوسری قراءت کی وضاحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''المجید میں دوسری قراءت جر کی ہے۔ اس صورت میں یہ العرش کی صفت ہو گا''۔[درسی تفسیر، ص:۱۴۷]

(۱۱) ایک اور معاصر مفسر مولانا عبداللطیف اپنی تفسیر کاشف البیان میں [المجید] کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''المجید۔۔۔ اس کو مرفوع [المجیدُ]، مجرور [المجیدِ] دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ مرفوع ہونے کی حالت میں یہ ودود یا ذو کی صفت ہے اور مجرور ہونے کی صورت میں عرش کی صفت ہے یعنی وہ بڑے عرش کا مالک ہے۔'' [تفسیر کاشف البیان، جلد ششم، ص:۵۱۵]

قارئین گرامی! مفسرین کی درج بالا وضاحت وصراحت سے یہ بات اظہر من الشّمس ہو گئی کہ المجید میں دو قراء تیں ہیں اور دونوں درست ہیں۔ لہٰذا آیت کا ترجمہ بھی دونوں طرح درست ٹھہرا۔ ان دلائل وبراہین کے ملاحظہ کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کو علم قراءت پر بھی مکمل عبور حاصل تھا اور انھوں نے بوقت ترجمہ مختلف قراء توں پر غور وخوض کر کے ترجمہ کا کام سرانجام دیا ہے۔ عربی زبان کے ماہرین اور فلسفۂ اِعراب سے آگاہ اہلِ علم وفن پر یہ بات مخفی نہیں کہ المجید مرفوع کے بجائے مکسور پڑھنے میں سلاست و روانی زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔''

ممتاز محقق ومصنّف صاحبزادہ ابوالحسن واحد رضوی نے حقِّ تحقیق ادا کر دیا:

''مفسرین کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ ''المجید'' کی دونوں قراْتیں درست ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے ''المجید'' کی دونوں قراْتیں درست ہیں تو ''المجید'' کو عرش کی صفت قرار دینے میں مولانا احمد رضا خاں کے نزدیک وہ کونسی حکمت تھی جس کے تحت اس اسلوب کو ترجیح دی گئی؟ اس کی حکمت یہ ہے کہ اس میں عقیدۂ توحید اور صفتِ الٰہی کی معرفت پائی جاتی ہے کہ اگر مملوک ''عرش'' اتنی عزت وعظمت کا حامل ہے تو اس کے مالک اللہ تعالیٰ کی عزت وعظمت کا کیا عالم ہو گا جسے الفاظ وبیاں احاطہ کرنے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا احمد رضا خاں نے ترجمے کے قاری پر اللہ تعالیٰ کی اسی شانِ مجیدیت کو خوب اجاگر کیا ہے۔''(دلاور)

حوالہ جات

۱۔ فاضل بریلوی کے کردار ونظریات کا مختصر جائزہ، مطبوعہ لاہور۔
۲۔ تفسیر الخازن، جلد چہارم مطبوعہ پشاور۔
۳۔ تفسیر نسفی برحاشیہ خازن، مطبوعہ پشاور۔
۴۔ تفسیر قرطبی جلد ۱۰، مطبوعہ تہران، ایران۔
۵۔ تفسیر رفاعی، مطبوعہ لاہور۔
۶۔ تفسیر کبیر جزء ۳۱، مطبوعہ قم، ایران۔
۷۔ تفسیر روح المعانی، جزء ۳۰، مطبوعہ لاہور۔
۸۔ تفسیر کاشف البیان مطبوعہ ہوتی، مردان۔
۹۔ تفسیر ریاض القرآن، ناشر جامعہ ریاض الاسلام، اٹک۔
۱۰۔ تفسیر تبیان القرن، فرید بکسٹال، لاہور۔
۱۱۔ تفسیر ابن کثیر، مطبوعہ کراچی۔
۱۲۔ درسی تفسیر پارہ عم، مطبوعہ اکوڑہ خٹک، سرحد، پاکستان۔

(ماخوذ: معارفِ رضا ۲۰۰۹ء)

الفجر ر

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (فجر: ۱۴)

۱۔ بے شک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں۔ (احمد رضا)

۲۔ بے شک آپ کا رب (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے۔ (کرم شاہ الازہری)

۳۔ بے شک تیرا رب (نافرمانوں کی) گھات میں ہے۔ (ابو منصور)

۴۔ بے شک تیرا رب لگا ہے گھات میں۔ (محمود الحسن)

۵۔ بے شک آپ کا پروردگار تاک میں ہے۔ (عبدالماجد)

۶۔ بے شک تیرا خداوند گھات میں رہتا ہے۔ (اصلاحی)

۷۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔ (مودودی)

۸۔ تمہارا پروردگار بے شک گھات میں ہے۔ (ثناء اللہ)

مذکورہ بالا تراجم میں ترجمہ نگاروں نے اللہ تعالیٰ کے لیے "گھات اور تاک" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ خاص طور پر گھات کا لفظ تو زیادہ ہی غیر مناسب ہے۔ "گھات" دراصل اس کمین گاہ کو کہتے ہیں جہاں شکاری یا دشمن کے انتظار میں بیٹھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گھات لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک وہ گھات لگانے سے پاک ہے۔ مرصاد، "رصد" کے مادہ سے کسی چیز کی نگہبانی کرنے کے لیے آمادگی کے معنیٰ میں ہے۔

دراصل آیتِ زیرِ بحث میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ گمان نہ کرو کہ کوئی شخص عذابِ الٰہی سے بچ جائے گا کیونکہ سب کچھ اس کے حیطۂ علم وقدرت میں ہے۔ وہ ایک ایک چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ کوئی شے اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ یہ امر واضح ہو کہ خدا کا کوئی مکان نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی گزر گاہ میں بیٹھتا ہے۔ دراصل لفظ مرصاد کی تعبیر اس بات کا کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لامحدود علم سے تمام سرکشوں کی سرکشی، مفسدوں کے فساد اور طاغیوں کی بغاوت کا بھرپور اور ہمہ جہت احاطہ کیے ہوئے ہے اور یہی وہ معنویت ہے جو احمد رضا بریلوی کے ترجمے میں نمایاں ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"بے شک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں"۔

(م، الف: ۱۷۵)

پورے مقالے میں مولانا احمد رضا خاں کا یہ واحد ترجمہ ہے جس پر ڈاکٹر اوج نے ڈنڈی نہیں ماری بلکہ مطلقاً اسے باقی سات تراجم پر ترجیح دی اور ثابت کیا کہ دیگر تراجم تقدیسِ الٰہی کے لیے غیر مناسب ہیں جبکہ مولانا احمد رضا خاں نے ترجمے میں شان وتقدیسِ الوہیت اور عقیدۂ توحید کی پاسبانی کا بھرپور فریضہ سرانجام دیا ہے۔

حاصلات: (Findings)

(۴۲) علم النحو کے برعکس اپنے ترجمے کو ترجیح دی گئی جس کا ترجمہ زمانۂ مستقبل مطلق کے تحت کیا گیا ہے۔

(۴۳) علم النحو کے برعکس ایسے ترجمے کو شامل ترجیح کیا گیا جس میں زمانۂ حال مطلق کے تحت ترجمہ کیا گیا ہے۔

(۴۴) ایسے ترجمے کو ترجیح دی گئی جس میں آیت کے کثیر الجہات معنیٰ کو محدود کر کے پیش کیا گیا ہے۔

(۴۵) ڈاکٹر اوج اپنی تحقیقات کی خود ہی نفی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

(۴۶) جمع کے لیے جمع استعمال کرنے والے ترجمے اور جمع کے لیے واحد استعمال کرنے والے ترجمے کو برابر قرار دیا گیا۔

(۴۷) معرفہ کے ترجمے کو نکرہ کے ترجمے کے برابر قرار دیا گیا۔

(۴۸) ایسے ترجمے کو ترجیح سے خارج کر دیا گیا جس میں مترجم نے اللہ تعالیٰ کی شانِ مجیدیت کو خوب اجاگر کیا ہے۔

(۴۹) مولانا احمد رضا خاں کے تراجم کو باقی سات تراجم پر کامل ترجیح حاصل ہے جبکہ ڈاکٹر اوج اسے جزوی ترجیح دے رہے ہیں۔

(۵۰) ڈاکٹر اوج نے مولانا احمد رضا کے صرف ایک ترجمے کو دیگر سات تراجم پر کامل ترجیح دی ہے۔

(۵۱) "آسمان کے اضافی ترجمے کو ترجیح سے خارج کر دیا جبکہ "مدار" کے اضافی ترجمے کو ترجیح میں شامل کیا گیا۔

(۵۲) مفسرین کے اقوال کی روشنی میں آیاتِ قسم میں "لازائدہ" کو ترجیح حاصل ہے جبکہ ڈاکٹر اوج اپنی ذاتی کاوش سے "لا منفصل" کو ترجیح دے رہے ہیں۔

(۵۳) مولانا احمد رضا خاں کے ایک آیت کے ترجمے کو بلا دلیل جزوی ترجیح دی گئی ہے۔

(۵۴) مولانا احمد رضا، مولانا ابو منصور اور مولانا امین اصلاحی کے ایک آیت کے ترجمے میں ترجیحاً مماثلت پائی جاتی ہے۔

(نوٹ: سابقہ اقساط کے تسلسل میں نمبر لکھے گئے ہیں۔ م، الف سے مراد مقالۂ اوج ہے)

(جاری۔۔۔)

آبِ مطلق و مقیّد تحقیقِ رضا کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری

اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں وضو اور غسل کے لیے پانی اور مٹی سے طہارت کا حکم دیا چنانچہ سورۂ مائدۃ ارشاد ہوتا ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ ؕ (سورۃ المائدۃ:٦) ''اے ایمان والوں جب نماز کو کھڑے ہونا چاہو تو اپنا منھ دھوؤ اور کہنیوں تک ہاتھ اور سروں کا مسح کرو اور گٹوں تک پاؤں دھوؤ اور اگر تمھیں نہانے کی حاجت ہو تو خوب ستھرے ہو لو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا یا تم نے عورتوں سے صحبت کی اور ان صورتوں میں پانی نہ پایا تو پاک مٹی سے تیمم کرو تو اپنے منھ اور ہاتھوں کا اس سے مسح کرو۔'' (کنزالایمان)

اس آیتِ کریمہ میں وضو اور غسل کا حکم اوّل پانی سے ہے اور اگر پانی میسر نہ ہو تو وضو اور غسل پاک مٹی سے تیمم کر کے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آیتِ کریمہ میں پانی اور مٹی سے طہارت کا حکم ہے مگر اس کی تفصیل کہ کس پانی سے طہارت اور کس پاک مٹی سے تیمم کیا جاسکتا ہے، احادیثِ نبوی کے بعد فقہائے کرام کی کتابوں سے اخذ کیا جاسکتا ہے بظاہر یہ معمولی نوعیت کی بات لگتی ہے کہ جو بھی پانی مل جائے اس سے وضو اور غسل کر لیا جائے اور جو بھی مٹی مل جائے اس سے تیمم کر لیا جائے مگر ۱۴۰۰ سال میں پانی اور پاک مٹی کی سینکڑوں نوعیتیں سامنے آئیں اگر اس کو موضوع بنا کر محققین کو دیا جائے تو دونوں موضوع یعنی اقسام پانی جن سے وضو و غسل کرنا جائز یا ناجائز اور پاک مٹی کی اقسام یا نوعیتیں جن سے تیمم جائز یا ناجائز ہے، پر Ph.D کے تھیسس لکھے جاسکتے ہیں۔ امام احمد رضا خاں قادری محدث بریلوی نے تنِ تنہا اس پر تحقیقی کام کیا ہے جو فتاویٰ رضویہ (جدید) جلد دوم کے صفحہ 451 تا 665، جلد سوم ص 41۔ 741، جلد چہارم ص 31، 320، یعنی 1200، صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی محقق صرف اس کام کو ایڈٹ کر کے تھیسس کی شکل میں پیش کر دے تو اس کو بھی Ph.D کی سند حاصل ہو سکتی ہے۔ اس مقالے میں نہایت اختصار کے ساتھ اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ امام احمد رضا نے ان دو عنوانات پر کن کن پہلوؤں سے تحقیق کی ہے اور اگر تفصیل میں جا کر ان 1200 صفحات کا مطالعہ کیا جائے تو پھر ان گنت تحقیقی مقالات لکھے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں احقر نے اب تک مندرجہ ذیل مقالات لکھے ہیں جو ''معارف رضا'' میں شائع بھی ہو چکے ہیں:

(۱) العطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویہ کا موضوعاتی جائزہ. معارف رضا سالنامہ، شمارہ ہشتم، ۱۹۸۸/ ۱۴۰۹ھ۔

(۲) امام احمد رضا اور پانی کی رنگت، ماہنامہ معارفِ رضا، شمارہ جنوری ۲۰۰۰ء۔

(۳) امام احمد رضا اور تحقیقِ مرجان، ماہنامہ معارفِ رضا، شمارہ فروری ۲۰۰۰ء۔

(۴) امام احمد رضا اور علمِ حجریات، ماہنامہ معارفِ رضا، شمارہ مارچ ۲۰۰۰ء۔

(۵) شریعتِ محمدی اور فتاویٰ رضویہ، ماہنامہ معارفِ رضا، شمارہ، جولائی، ۲۰۰۹ء۔

(۶) اقسام مٹی، مسئلۂ تیمم اور تحقیقِ رضا، سالنامہ معارفِ رضا، شمارہ ۳۱، ۲۰۱۱ء۔

امام احمد رضا خاں قادری محدث بریلوی علیہ الرحمۃ نے برصغیر پاک وہند میں فتاویٰ عالمگیریہ کے بعد سب سے مستند اور سب سے زیادہ تحقیقی کام فتاویٰ رضویہ کی صورت میں پیش کیا جو 12 ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے جب کہ اس کی جلدِ اوّل صرف کتابِ طہارت پر مشتمل ہے جو کہ 900 صفحات پر مشتمل ہے جس کو جدید فتاویٰ رضویہ کی 4 جلدوں میں دیکھا جاسکتا ہے صرف کتابِ طہارت پر ایک ضخیم جلد اس بات کی غماض ہے کہ امام احمد رضا کو فقہ میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی اور برصغیر کے تمام فتاویٰ کو دیکھ لیا جائے کسی فقیہ اور کسی

مفتی کے فتاویٰ میں کتاب طہارت اتنی ضخیم مرتب نہیں ہوئی۔ یہ ایک الگ موضوع تحقیق ہو جائے گا کہ کتاب "طہارت میں فقہائے ہند کی خدمات"۔ یہاں بتانا مقصود یہ ہے کہ اس کتاب طہارت میں ۳/۲ جلد صرف باب المیاہ اور باب التیمم پر مشتمل ہے جس کا ہر صفحہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ہر صفحے پر آپ کو علم کا خزانہ ملے گا۔ امام احمد رضا نے ان دونوں ابواب کے تحت جو باقاعدہ رسائل مقالے کی صورت میں تحریر فرمائے ہیں ان کا نہایت اختصار سے تعارف کرواتا چلوں۔ باب المیاہ کے اندر سب سے پہلا جو مقالہ (رسالہ) لکھا وہ آبِ مستعمل کی تعریف میں ہے۔ رسالے کا نام ہے:

"الطرس المعدل فی حد الماء المستعمل" (۱۳۲۰ھ)

(استعمال شدہ پانی کی تعریف میں منصف صحیفہ)

مسئلہ: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آبِ مستعمل کی کیا تعریف ہے:

الجواب: اقول وباللہ التوفیق مائے مستعمل وہ قلیل پانی ہے جس نے یا تو تطہیر نجاست حکمیہ سے کسی واجب کو ساقط کیا یعنی انسان کے کسی ایسے پارۂ جسم کو مس کیا جس کی تطہیر وضو یا غسل سے بالفعل لازم تھی یا ظاہر بدن پر اس کا استعمال خود کار ثواب تھا اور استعمال کرنے والے نے اپنے بدن پر اسی امر ثواب کی نیت سے استعمال کیا اور یوں اسقاط واجب تطہیر یا اقامت قربت کرکے عضو سے جدا ہوا اگرچہ ہنوز کسی جگہ مستقر نہ ہوا بلکہ روانی میں ہے اور بعض نے زوالِ حرکت وحصولِ استقرار کی بھی شرط لگائی۔ یہ بعونہٖ تعالیٰ دونوں مذہب پر حد جامع مانع ہے کہ ان سطروں کے سوا کہیں نہ ملے گی۔"

امام احمد رضا نے اس مائے مستعمل کو بحث میں لانے کے بعد ماحاصل کو چند اشعار میں نظم کیا۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: "بفضلِ الٰہی خدمت کلمات علمائے کرام سے اس فقیر پر القا ہوئے۔ وللہ الحمد سہولتِ حفظ کے لیے فقیر اسے نظم کرتا ہے اور برادرانِ دینی سے دعائے عفو وعافیت کی طمع رکھتا ہے

مائے مستعمل کہ طاہر نامطہر وصف اوست
جامع و مانع حدِ او از رضاؔ دو حرف شد
مطلقے کو واجب شستن زحد ثے کا ست یا
بر بشر در قربت مطلوبہ عیناً صرف شد
راکدے کا ینسان جداشد ازبدن مستعمل ست
لیک نزد بعض چوں قائم بجا یا ظرف شد

ترجمہ: "مستعمل پانی جو کہ خود پاک ہوتا ہے اور دوسرے کو پاک نہیں کرتا رضاؔ سے اس کی جامع مانع تعریف دو باتوں میں ہوئی: (۱) جس سے مطلقاً حدث زائل ہوا ہو یا قربت مقصودہ کی نیت سے بدن پر استعمال ہوا ہو۔ (۲) قلیل پانی جب بدن سے جدا ہوا تو مستعمل ہو جائے گا لیکن بعض کے نزدیک بدن سے جدا ہو کر کسی جگہ یا ظرف میں اس کا قرار ضروری ہے۔" راکد بمعنیٰ غیر جاری یعنی آب قلیل کہ دَہ دردَہ نباشد۔" [دَہ دردَہ یعنی 10x10 ہاتھ] (یہ رسالہ ص ۴۳ سے ۱۱۲ تک ہے) اس کے علاوہ چند اور رسائل جو مائے مستعمل سے متعلق ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۲) النمیقۃ الانقٰی فی فرق الملاقی والملقٰی (۱۳۲۷ھ)

(ملنے والے اور ڈالے گئے پانی کے فرق میں ایک پاکیزہ تحریر)

اس رسالے میں اس پانی سے بحث کی ہے کہ جب کسی بے وضو اور جنبی کا ہاتھ یا انگلی یا ناخن وغیرہ لوٹے یا گھڑے کے پانی میں پڑ جائے تو وہ وضو کے قابل رہتا ہے یا نہیں۔ اس رسالے کو ص 113 تا 248 تک جلد دوم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ابتدائے جواب میں رقمطراز ہیں: "راجح ومعتمد یہ ہے کہ مکلف پر جس عضو کا دھونا کسی نجاستِ حکمیہ مثل حدث وجنابت وانقطاع حیض ونفاس کے سبب بالفعل واجب ہے وہ عضو یا اس کا کوئی حصہ اگرچہ ناخن یا ناخن کا کنارہ آب غیر کثیر میں کہ نہ جاری ہے نہ دہ دَردہ بے ضرورت پڑ جانا پانی کو قابلِ وضو وغسل نہیں رکھتا یعنی پانی مستعمل ہو جاتا ہے کہ خود پاک ہے اور نجاستِ حکیمہ سے تطہیر نہیں کر سکتا اگرچہ نجاستِ حقیقیہ اس سے دھو سکتے ہیں یہی قول نجیح ورجیح ہے۔ (فتاویٰ رضویہ جدید، جلد دوم، ص ۱۱۳)

(۳) الھنیئ النمیر فی الماء المستدیر (۱۳۳۴ھ)

(خوش گوار صاف آبِ مستدیر کی تحقیق)

اس رسالے میں اس کنویں اور حوض سے متعلق دریافت کیا گیا ہے کہ اس کا کیا سائز ہونا چاہیے کہ اگر کوئی نجاست اس میں گر جائے تو کب وہ پانی ناپاک قرار پائے گا۔ اس کے جواب میں یہ رسالہ تحریر کیا جو ص 285 تا 308 تک مشتمل ہے۔ اس رسالے میں 4 قول نقل کیے کہ حوض کا سائز 48 ہاتھ، 46 ہاتھ، 44 ہاتھ اور 36 ہاتھ پر مشتمل بتایا

گیاہے۔جب کہ اپنی تحقیق سے اس کا سائز ۲/۱ 35 ہاتھ ثابت کیاہے۔

(۴) رحب الساحة فی میاہ لایستوی وجهها وجوفها فی المساحة الماحة (۱۳۳۴ھ)۔

(ان پانیوں کے بارے میں میدان وسیع کرنا جن کی سطح اور گہرائی پیمائش میں برابر نہ ہو۔

اس رسالے میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ پانی گہرائی کے لحاظ سے کتنا ہو کہ اگر اس میں کوئی نجاست گر جائے تو وہ پانی ناپاک نہ ہو گا۔ چنانچہ آپ نے 100 صفحات پر مشتمل ایک طویل فتویٰ مرتب کیا اور یہ رسالے کی صورت میں جدید فتاویٰ رضویہ کی جلد دوم میں ص321 سے 423 تک پھیلا ہوا ہے۔

اس رسالے کے سوال میں مستفتی نے دریافت کیا ہے کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ان مسائل میں سوال اوّل: حوض نیچے دَہ در دَہ (10X10 ہاتھ) اور اوپر کم ہے بھرے ہوئے میں نجاست پڑی تو سب ناپاک ہو گیا یا صرف اوپر کا حصّہ جہاں تک سو ہاتھ سے کم ہے۔ اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا گیا جس کی ابتدا ہی میں امام احمد رضا نے اپنا موقف پیش کر دیا ہے اور پھر اس کی تفصیل رسالے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آپ جواب تحریر فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''بعض کے نزدیک اصلاً ناپاک نہ ہو گا کہ مجموعہ آب کثیر ہے اور میں کہتا ہوں یہ گہرائی کے اعتبار پر مبنی ہے اور بعض نے اس کو صحیح قرار دیا اور اس پر اعتماد نہیں''۔ آگے چل کر رقمطراز ہیں: ''اور صحیح یہ ہے کہ صرف وہی بالائی حصہ ناپاک ہو گا جو دہ در دَہ سے کم ہے، یہاں تک کہ اگر اوپر کا پانی نکال دیا گیا اور آب وہاں تک رہ گیا جہاں سے دہ دہ دہ ہے تو یہ پانی پاک ہے اس لیے کہ اگرچہ وہ آب نجس سے متّصل تھا مگر آب کثیر اتصال نجس سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک نجاست سے اس کا رنگ یا بو یا مزہ بدل نہ جائے۔'' (فتاویٰ رضویہ جدید، جلد دوم، ص324-321)

(۵) هبة الحبیر فی عمق ماء کثیر (۱۳۳۴ھ)

(ابر باراں کا عطیہ زیادہ پانی کی گہرائی میں)

اس استفتا میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ آبِ کثیر جاری کے لیے کتنا عمق (گہرائی) درکار ہے کہ نجاست کے باوجود وہ پاک رہے۔ اس کے جواب میں یہ رسالہ تحریر فرمایا اس عمق کے لیے گیارہ (۱۱) قول نقل کیے اور اس کا تفصیلی جواب 25 صفحات پر مشتمل ہے جو ص425 تا 450 تک دیکھا جاسکتا ہے۔

امام احمد رضا نے جو گیارہ اقوال نقل کیے ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

(۱) کچھ درکار نہیں صرف اتنا ہو کہ اتنی مساحت میں زمین کہیں کھلی نہ ہو

(۲) بڑا درھم کہ 0.4 ماشے ہوتا ہے اس کے عرض سے کچھ زیادہ گہرا ہو

(۳) اس میں سے پانی ہاتھ سے اٹھائیں تو زمین کھل نہ جائے۔

(۴) پانی لینے میں ہاتھ زمین کو نہ لگے۔

(۵) ٹخنوں تک ہو۔

(٦) چار انگل کشادہ (اقول یہ تقریباً نو انگل یعنی تین گرہ ہو۔

(۷) ایک بالشت۔

(۸) ایک ہاتھ۔

(۹) دو ہاتھ۔

(۱۰) سفیہ سکہ اس میں ڈال کر دیکھے تو روپیہ نظر نہ آئے۔

(۱۱) اپنی طرف سے کوئی تعین نہیں ناظر کی رائے پر موقوف ہے۔

یہ گیارہ اقوال پیش کرنے کے بعد ان کا حوالہ دیتے ہیں اور کون کون سا قول صحیح ہے اس کی نشاں دندہی کرتے ہیں: ''ان میں قول سوم عامۂ کتب میں ہے اور اول و دوم و ہفتم و ہشتم بدائع و تبیین و فتح میں نقل فرمائے اور چہارم خانیہ وغنیہ پنجم جامع الرموز، ششم غنیہ نیز مثل نہم و یازدہم قہستانی و نہم شرح نقایہ برجندی میں۔ ان میں صرف دو قول مصحح ہیں: اوّل (۱) وسوم (۳) وبس'' (فتاویٰ رضویہ، جدید، جلد دوم، ص27-425)

امام احمد رضا کے نزدیک ان اقوال میں صرف دو صحیح ہیں کہ صرف اتنا ہو کہ اتنی مساحت میں زمین کہیں کھلی نہ ہو اور جب اس میں سے پانی ہاتھ سے نکالیں یا اٹھائیں تو زمین کھل نہ جائے۔

باب المیاہ میں آبِ مطلق اور آب مقید کے سلسلے میں طویل بحث اور تحقیق کی گئی ہے جس کے باعث ایک بہت ہی ضخیم رسالہ بعنوان ''النور والنورق لاسفار الماء المطلق'' (۱۲۲۴ھ) تحریر کیا گیا ہے، جس میں 2 ضمنی رسائل بھی ترتیب دیے گئے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) عطاء النبی لافاضة احکام ماء الصبی (۱۳۳۴ھ)

(بچے کے حاصل کردہ پانی کے احکام کے متعلق نبی پاک ﷺ کا عطیہ)

(۲) الدقة والتبیان لعلم الرقة والسیلان (۱۳۳۴ھ)

[(پانی کی) رقت وسیلان کا واضح یا روشن بیان]

امام احمد رضا خاں محدث بریلوی سے جب استفسار کیا گیا کہ: ''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آبِ مطلق کہ وضوو غسل کے لیے درکار ہے اس کی کیا تعریف ہے، آبِ مقید کسے کہتے ہیں؟''تو اس کے جواب میں امام احمد رضا نے ایک طویل رسالہ بعنوان ''النور والنورق لاسفار الماء المطلق'' لکھا جو 450 صفحات پر مشتمل ہے اس رسالے میں خطبہ رسالہ کے بعد اس کی طوالت سے متعلق خود ہی رقمطراز ہیں:''یہ سوال بظاہر چھوٹا ہے اور اس کا جواب بہت طول چاہتا ہے۔ یہ مسئلہ نہایت معرکۃ الآرا ہے۔ فقیر بتوفیق القدیر اول(۱) جزئیات منصوصہ ذکر کرکے (۲) پھر تعریف مطلق ومقید کہ اصالۃً ضابطہ جامعہ کلیہ ہے اور دیگر ضوابط کے لیے معیار(۳) پھر ضوابطہ جزیہ متون(۴) پھر ضوابطہ کلیۂ متاخرین(۵) پھر جزئیات جدیدہ کے احکام۔''(فتاویٰ رضویہ، جدیدہ، جلد دوم، ص۴۵۱)

پہلے ملاحظہ کیجیے اس رسالہ پر خطبہ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ حمد وصلاۃ بھی بیان ہو رہی ہے اور استفتا کا جواب بھی دیا جارہا ہے اور حمد و صلاۃ کے لیے وہ الفاظ استعمال فرمارہے ہیں کہ اصطلاحاً وہ آبِ مطلق اور آبِ مقید سے تعلق رکھتے ہیں اور ان ہی الفاظ میں حمد وثنا بھی بیان کی جارہی ہے:''الحمد لله الذی انزل من السماء ماء طهورًا لیطهرنا به تطهیرًا حمداً مطلقاً غیر مقید بعدداوامد دائماً ابداً کثیراً کثیراً۔ والصلاة والسلام علی الطیب الطاهر الطهور المطهر المفضل علی الخلق فضلا کبیرا۔ وعلیٰ اٰبه وصحبه وابنه وحزبه ماامطرت السحب ماء نمیراً۔ اٰمین اللهم هدایة الحق والصواب''(تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے آسمان سے پاک پانی اتارا کہ اس کے ذریعے ہمیں پاک صاف کرے۔ مطلق تعریفیں بغیر کسی قید عددی اور غائی کے ہمیشہ ہمیشہ بہت زیادہ اسی کے لیے ہیں۔ طیب، طاہر، پاک کرنے والے اور مخلوق پر فضیلت رکھنے والے پر اور آپ کے آل، اصحاب، بیٹے اور گروہ پر بے شمار صلوۃ وسلام ہوں جب تک بادل وافر پانی برساتے رہیں۔ (آمین) اے اللہ ہمیں سچے اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرما)۔''(فتاویٰ رضویہ جدید، جلد دوم، ص۴۵۱)

امام احمد رضا نے اس رسالے کو ۵ فصلوں پر تقسیم کیا اور فصل اول میں جزئیات منصوصہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کو مزید ۳ حصوں میں تقسیم کیا۔

قسم اول: وہ پانی جن سے وضو صحیح ہے۔ اس ضمن میں 160 منصوصہ کا ذکر کیا جن سے بالاتفاق وضو جائز ہے، 122 منصوصات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ بالاتفاق ان سے وضو ناجائز ہے۔ جبکہ قسم سوئم میں 22 منصوصات کا ذکر کیا جس میں بتایا کہ یہ پانی صحت وضو میں حکم منقول ومقتضائے ضابطہ امام زیلعی کا خلاف ہے۔

آخر میں 42 جزئیات جدیدہ اپنی تحقیق سے پیش کیے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم تحقیق یہ ہے کہ کیا پانی کا کوئی رنگ ہے یا یہ بے رنگ مائع ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ پانی بے لون(بے رنگ) ہے اور خود کوئی رنگ نہیں رکھتا۔ حتیٰ کے فاضل احمد بن ترکی المالکی نے ''مقدمہ عشماویہ'' کی شرح ''جواہر ذکیہ'' میں اس کی یہ تعریف کی ہے کہ پانی ایسا لطیف بہنے والا جوھر ہے جس کا اپنا کوئی رنگ نہیں بلکہ برتن کے رنگ سے رنگ دار دکھائی دیتا ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ جدید، جلد سوم، ص۲۳۵)

امام احمد رضا اپنا موقف پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:''میں کہتا ہوں کہ ان پر لازم تھا کہ وہ یوں تعریف کرتے کہ اس میں ملنے والی چیز سے رنگ دار ہوتا ہے کیونکہ آخری جملہ بیان کا محتاج رہتا ہے۔ اسی لیے اس کے محشی سفطی مالکی نے کہا ہے کہ شفاف ہونے کی وجہ سے برتن کا رنگ اس میں ظاہر ہوتا ہے جب سبز برتن میں ڈالیں اور سبزی پانی کو نہیں لگتی بلکہ وہ رقت کی بنا پر برتن کے رنگ کے لیے حاجب نہیں بنتا۔'' (فتاویٰ رضویہ جدید، جلد سوم، ص۲۳۶)

امام احمد رضا پانی کے بے رنگ موقف کے سلسلے میں ''شرح مواقف'' سے بھی ایک حوالہ نقل کرتے ہیں ''برف شفاف اجزا سے مرکب ہے، اس کا کوئی رنگ نہیں بلکہ وہ پانی کے باریک اجزا ہیں۔'' (فتاویٰ رضویہ جدید، جلد سوم، ص۲۳۶)

امام احمد رضا اس موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں کہ شاید کوئی یہ خیال کرے کہ اجزا باریک ہونے کے باعث کوئی رنگ نہ رکھتے ہوں تو ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ اپنی رائے پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:''ایسا ہرگز نہیں کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ بادل کے بخارات میں رنگ ظاہر ہوتا ہے اور یہ رنگ پانی کے اجزا کا رنگ ہے۔ حالانکہ یہ اجزا برف کے اجزا سے زیادہ باریک ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے برف اوپر سے گرتی ہے کہ اجزا بخارات سے بھاری ہیں اور بخارات اوپر کو اٹھتے ہیں۔ باریک اجزا اگر علیحدہ ہوں تو نظر نہیں آتے

تو اس کا رنگ کیسے نظر آئے گا اور چھوٹے اجزا جب جمع ہوں تو نظر آتے ہیں تو ان کا رنگ بھی نظر آئے گا جیسا کہ بخارات اور دھویں میں'' (فتاویٰ رضویہ جلد، جلد سوم، ص236)

مزید طویل بحث کے بعد امام احمد رضا نے پانی کے حقیقی رنگ سے متعلق اپنے مشاہدات اور تحقیق مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

''حقیقت امر یہ ہے کہ پانی خالص سیاہ نہیں مگر اس کا رنگ سفید بھی نہیں بلکہ میلا مائل بیک گونہ سواد خفیف ہے اور وہ صاف سفید چیزوں کے بمقابل آکر کھل جاتا ہے جیسا کہ ہم نے کپڑے کا ایک حصّہ دھونے اور دودھ میں پانی ملانے کی حالت بیان کی۔'' (فتاویٰ رضویہ، جلد سوم، ص245)

اس طرح ایک اور بحث تفصیل سے کی گئی ہے کہ کون سا پانی افضل ہے آبِ کوثر یا زم زم یہ ابحاث پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ امام احمد رضا نے آخر میں اپنی تحقیق سے کچھ جدید جزئیات جدیدہ کا ذکر بعنوان ''ضابطۂ رضویہ'' کے نام سے کیا اور تفصیل میں جانے سے پہلے انتہائی انکساری کا اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ششم ضابطۂ رضویہ:

''سبحٰن اللہ فقیر بھی کوئی شے ہے کہ احکام میں زبان کھول سکے حاشا ضابطہ وہی ضابطہ امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ ہے۔ باتباع علما اس کے اجمال کو مفصل کر دیا ہے۔ تفاصیل میں خدمت گاری کلام اکابر کے صدقے سے جن تحقیقات کا افاضہ ہوا ان پر ابتنائے شقوق کیا ہے۔ جملہ ضوابطِ صحیحہ مذکورہ کو ایک دائرے کے احاطے میں لیا ہے۔ اس نے بیان کو اظہر واجمع وانور وانفع کرکے ضابطے کے لیے خلعت جدت سیا ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ، جدید، جلد سوم، ص ۲۱۲)

فصل دوم میں پانی کی آبِ مطلق اور آبِ مقید کی بھی طویل بحث فرماتے ہیں اور ۱۲ مختلف تعریفوں کے بعد اپنی تحقیق اس سلسلے میں پیش فرماتے ہیں: بالجملہ تحقیق فقیر غفرلہٗ میں مائے مطلق کی تعریف یہ ہے کہ وہ پانی کہ اپنی رقّتِ طبعی پر باقی ہے اور اس کے ساتھ کوئی ایسی شے مخلوط وممتزج نہیں جو اس سے مقدار میں زاید یا مساوی ہے نہ ایسی جو اس کے ساتھ مل کر مجموع ایک دوسری شے کسی جدا مقصد کے لیے کہلائے ان تمام مباحث بلکہ فہیم کے لیے جملہ فروعِ مذکورہ وغیر مذکورہ کو ان دو بیت میں منضبط کریں۔

مطلق آبے ست کہ بررقتِ طبعی خودست
نہ درو مزج دگر چیز مساوی یا بیش
نہ بخلطے کہ بترکیب کند چیز دگر
کہ بود ز آب جدا درلقب ومقصد خویش

(فتاویٰ رضویہ، جدید، جلد ۲، ص ۶۷۹)

امام احمد رضا خاں محدث بریلوی نے اپنے اس رسالے میں ایک دو نہیں تقریباً 300 کتب کو ماخذ بنایا ہے، جس میں کتبِ احادیث، فتاویٰ اصولِ فقہ، کتبِ فقہ، تاریخ، تفاسیر اور لغت کی کتب شامل ہیں۔ امام احمد رضا نے کتابِ طہارت کے باب المیاہ کی تحقیق میں سینکڑوں صفحات میں 12 سو سالہ فقہائے کرام کے اقوال کو جمع کیا جو یقیناً ایک دقت طلب کام ہے، جو آج کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت کے باعث قدرِ آسان ہے مگر امام احمد رضا 100 سال قبل 300 سو کتب کے موضوعات اور عبارتوں کو اپنے ذہن اور حافظے میں رکھ کر تحقیق کر رہے ہیں جو تعجب سے کم نہیں مگر یہ جس کے باعث ان کا حافظہ آج کل کے کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا آج بھی اگر کوئی محقق اس کام کو کرنا چاہے بلکہ وہ یہ تحقیق کرے کہ آبِ مطلق اور آبِ مقید کون کون سے پانی ہیں یا کن کن صورتوں میں ہمارے فقہائے کرام نے پانی کو آبِ مطلق قرار دے کر اس سے وضو کو جائز بتایا ہے اور کن کن پانی سے وضو کو ناجائز کہا ہے تو اس کو مہینوں لگ جائیں گے مگر امام احمد رضا جب بھی کوئی رسالہ لکھتے ہیں تو ان کی عادت ہے کہ وہ ایک ہی نشست میں اس کو مکمل فرماتے ہیں۔ سینکڑوں صفحات پر مشتمل یہ رسالہ جس میں کئی ضمنی رسائل بھی شامل ہیں اور آخر میں آپ نے ضابطے بھی پیش کیے ہیں۔ کس طرح انھوں نے ایک نشست میں یا ایک دن میں چند یوم میں مکمل کر لیا یقیناً ھذا من فضل ربی کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ احقر نے اس مقالے میں تو کسی ایک بحث کو بھی بیان نہیں کیا ہے۔ ایک ایک بحث اور اس پر اس کے دلائل پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں پھر ان سب دلائل کو اکٹھا کرنا اس سب کی توجیہ کرنا ان سب میں سے موافق اور مخالف کو علیحدہ کرنا یہ تحقیق کا بہت بڑا کام ہے جو یہاں صرف ایک مسئلے کے حوالے سے بیان کیا جارہا ہے امام احمد رضا صرف اس مسئلے میں نہیں بلکہ ہزاروں مسئلوں میں اور ہر فن میں اسی طرح تحقیق کرتے نظر آتے ہیں۔

ہبہ کی بحث اور تحقیق رضا

صبا نور (پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، پاکستان)

خلاصہ: دینِ اسلام انسانوں کو وہ معاشی نظام کا تصور دیتا ہے جہاں تمام انسان برابر ہیں، لیکن درجات میں تفاوت فطری ہے۔ خداتعالیٰ نے جن افراد کو کثیر مال و دولت سے نوازا تو دوسری طرف محروم افراد کے حقوق بھی ان کے ذمے لگا دیے۔ ہبہ کا تصور بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ غربا، فقرا کی کفالت کا مناسب بندوبست ہو سکے۔ مولانا احمد رضا نے اس موضوع پر تفصیلاً بحث فرمائی اور اپنی تحقیق سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ "فتح الملیک فی حکم التملیک" میں ہبہ اور تملیک کے بارے میں محققانہ بحث کی۔ علاوہ ازیں کتاب الہبہ میں بہت سی متبادل صورتوں کو پیش کیا جو اس مقالے کا حصّہ ہیں۔

تمہید

تحفے تحائف کا تبادلہ مستحسن عمل ہے۔ اس سے باہمی اخوت، بھائی چارے کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی سے اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ دین اسلام کا یہ تصور اس حکمت پر مبنی ہے کہ معاشرے کے کمزور و نادار فقرا کی مدد ہو سکے اور وہ افراد جو زکوٰۃ و صدقات کی رقم لینے میں قدرے ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں ان کی مدد بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کوئی مال دار شخص کسی بھی فرد کو اپنی دولت اس قانونِ ہبہ کے تحت دے سکتا ہے۔

طریقۂ کار

زیرِ نظر مقالے میں ہبہ کا معنیٰ و مفہوم شرع مطہرہ سے اس کے جواز کا ثبوت بیان کیا گیا ہے اور دیگر کتبِ فقہ سے ہبہ کی شرائط بیان کی گئیں ہیں۔ خصوصاً مولانا احمد رضا کی ہبہ کے موضوع پر محققانہ تحقیق کو اس مقالے کا حصّہ بنایا گیا ہے جو کہ انہوں نے رسالہ فتح الملیک فی حکم التملیک میں بیان کیں۔ آخر میں اس تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج خلاصہ اور ماخذ و مراجع درج کر دیے گئے ہیں۔

تحدید

مولانا احمد رضا کی ہبہ کے موضوع پر تحقیق کئی ایک مقالوں کی متقاضی ہے۔ اس مقالے میں آپ کے رسالے فتح الملیک فی حکم التملیک اور کتاب الہبہ سے مسائل کا جزوی احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اعتذار

کتاب الہبہ سے متعلق منفرد تحقیقات العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ میں تفصیلاً موجود ہیں۔ مولانا احمد رضا نے ہبہ اور تملیک سے متعلق نہ صرف منفرد انداز میں بیان کیا بلکہ کئی اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور جائز متبادل صورتوں کی طرف راہنمائی فرمائی۔ زیرِ نظر مقالے میں ان موضوعات کو شاملِ تحقیق کیا گیا ہے۔

مقاصد تحقیق

(ا) اسلام کے معاشی تصور میں ہبہ کا معنیٰ و مفہوم واضح طور پر بیان کرنا۔
(۲) ہبہ سے متعلق مولانا احمد رضا کی تحقیق کو بیان کرنا۔
(۳) ہبہ اور تملیک کے بارے میں مولانا احمد رضا کی منفرد تحقیق کا احاطہ کرنا اور عام لوگوں کو اس سے روشناس کرانا۔

معنیٰ و مفہوم

اسلام کا معاشی نظام دیگر دوسرے نظاموں سے یک سر مختلف اور جدا گانہ ہے، جو تمام انسانوں کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی، باہمی تعاون، ہمدردی و ایثار اعتدال و توازن سے گزارنے کا درس دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی شخص اپنی طرف سے کسی دوسرے کو تحفے کے طور پر کوئی شے دیتا ہے یہ تحفہ بغیر کسی معاوضے کے اور بدلے کے دیا جاتا ہے، جس میں کلی طور پر اُس شخص کو مالک کر دیا جاتا ہے۔

مختلف کتبِ فقہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے: "کسی بھی چیز کا دوسرے کو بلا عوض مالک کر دینا ہبہ ہے۔"[1]

احادیثِ مبارکہ ﷺ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں ایک دست یا کھر کے لیے (مہمان) بلایا جاؤں تو ضرور جاؤں اور اگر میرے پاس ایک دست یا کھر ہدیہ بھیجا جائے تو ضرور قبول کروں۔[2] یعنی کسی کے دیے ہوئے تحفے کو حقیر نہیں

سمجھنا چاہیے۔ آقا علیہ الصلوٰۃ السلام نے کُھر کی مثال دی، ہدیۃً کسی بھی صورت میں ہو اس کو قبول کرلینا چاہیے۔ اسی طرح بعض احادیث سے یہ بات بھی واضح ہے کہ تحفے تحائف سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور اس سے حسد و کینہ جیسی بیماریوں سے نجات ملتی ہے اور یہ بھی خیال نہ کرے کہ تحفہ دینے میں ہلکی یا حقیر سی ہے یا ذرا سی چیز ہدیہ کی جائے اور دوسرا شخص بھی نکتہ چینی کرے کہ یہ چھوٹی سی بھیجی ہے اس سے ممانعت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اے مسلمان عورتوں! کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی کو حقیر نہ سمجھے۔ اگرچہ بکری کا کُھر ہی ہوں کیوں نہ بھیجے۔ ۳

کتبِ فقہ اور ہبہ

مختلف کتبِ فقہ میں تحفے کے طور پر دی گئی اشیا سے متعلق تفصیلات موجود ہیں۔ بیشتر جگہ اس عقد کے صحیح ہونے کی شرائط بیان کی گئی ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ جس کو تحفہ دیا جائے وہ شخص عاقل و بالغ ہو۔ نابالغ نے کسی کو کوئی شے تحفے کے طور پر دی تو یہ درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح غلام کا دیا ہوا تحفہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ جو شے تحفے کے طور پر دی جائے اس کا موقع پر موجود ہونا اور مالک کے مکمل قبضے میں ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح ان اشیا کا ایجاب و قبول بھی ضروری ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ تحفے کے طور پر دی گئی اشیا دوسرے شخص کی ملک ہو جاتی ہیں۔ اس عقد کے قائم ہونے کے الفاظ صریح اور واضح ہوں، جن سے معلوم ہو کہ واقعتاً شے تحفے کے طور پر دی گئی ہے۔ جیسے کہا جائے میں نے تجھے یہ شے ہبہ کی یا یہ کہ میں نے تمہیں اس شے کا مالک کیا۔

دوسرا شخص اس تحفے کو قبول نہ کرے اس کے حق میں یہ عقد قائم نہیں ہوگا۔ تحفہ قبول کرنا کبھی اس شخص کے فعل سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی وہ الفاظ سے واضح طور پر قبولیت کا اظہار کرتا ہے۔ ہدیۃً دی گئی شے پر متعلقہ شخص کا کامل قبضہ بھی ضروری ہے۔ ۴

جو شے تقسیم کے قابل ہو اس کو بغیر تقسیم کیے اور دوسرے کی ملک اور غیر کے حقوق سے جدا کیے بغیر اس کو ہبہ کرنا جائز نہیں۔ تقسیم کے قابل نہ ہو تو اس کے لیے مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس شخص کا کتنا حصّہ باقی ہے۔ یہ معلوم نہ ہو تو معاملہ غلط ہوگا۔ ۵

تحفے کے طور پر دی گئی اشیا کو واپس لینا درست نہیں۔ چند صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں تحفہ واپس کیا جاسکتا ہے، لیکن لینے والے نے اس کا کچھ معاوضہ دیا یا دونوں میں سے کسی ایک کی وفات ہو جائے اور جس کو دیا وہ اس کا رشتے دار ہو، زوجین ہوں تو یہ شے واپس نہیں لی جاسکتی۔ ۶

مولانا احمد رضا اور ہبہ و تملیک

مولانا احمد رضا چودھویں صدی کی وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے تمام علوم پر قلم اٹھایا۔ معاشیات کا شعبہ بھی ان علوم میں شامل ہے۔ معاشیات کا علم نہایت ہی وسیع ہے جس کے گونا گوں پہلو ہیں۔ امام احمد رضا کے دور کا جائزہ لیں تو یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت اس علم سے متعلق عوام الناس میں آگاہی نہ تھی بلکہ دنیا میں خصوصاً مغربی ممالک میں یہ شعبہ پوری طرح سے متعارف ہی نہ ہوا تھا۔ اس دور میں مولانا نے اپنی تصانیف میں بینکنگ سسٹم سے متعلق کافی بحث کی۔ اس طرح اسلامی معاشیات سے متعلق جو مواد ہمیں گذشتہ زمانے کے ائمہ و فقہا کی تصانیف میں نظر آتا ہے اُن موضوعات پر تفصیل سے لکھا اور بعض مسئلوں کے جواب میں ایک پورا رسالہ تحریر فرمادیا۔

انہی موضوعات میں سے ایک موضوع ہبہ کا بھی ہے۔ مولانا احمد رضا نے تمام عقود کو تملیک کی بحث میں سمیٹا ہے۔ ہبہ کا عنوان تملیک بلا عوض ہے آپ نے رسالہ ''فتح الملیک فی حکم التملیک'' میں تملیک اور ہبہ کا فرق واضح کیا۔ فرماتے ہیں: ہبہ مفت میں کسی چیز کا مالک بنانا ہے۔ ہبہ خاص تملیک عین بلا عوض کا نام ہے، مگر عام طور پر ان الفاظ سے کہ میں نے ایک شے کا تجھے مالک بنایا یا اس چیز کی تجھے تملیک کی ان الفاظ سے ہر شخص ظاہری طور پر یہی مفہوم مراد لیتا ہے کہ یہ شے ہبہ کی گئی ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں ایسی کوئی فصل، کوئی باب قائم نہیں ہوا جس میں تملیک عین بلا عوض ہو اور وہ ہبہ بھی نہ ہوا اگر ایسا کچھ ہوتا تو کتبِ فقہ میں جیسے بیع ہبہ، عاریۃً، اجارہ وغیرہ کے باب بنائے گئے ہیں در حقیقت تملیک ہبہ سے عام ہے اور یہ تملیک بالعوض ہو یا بلا عوض سب عقود انہی کے تحت آتے ہیں لہٰذا یوں کہنا کہ میں نے اس شے کا تجھے

مالک بنایا اس سے ہبہ کا عقد ہی مراد لیا جائے گا جب تک کوئی دوسرے الفاظ کا اظہار نہ کیا۔ ۷

شرائط ہبہ

معاملات کو درست انداز سے قائم کرنے کے لیے کچھ شرائط ہوتیں ہیں۔ انہی میں سے بعض ایسی شرائط جن کا تقاضا عقد نہیں کرتا ان کے ساتھ کسی عقد کو مشروط کرلیا جاتا ہے۔ مولانا احمد رضا اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ کچھ شرائط فاسد اور بے جا ہوتیں ہیں ان کی وجہ سے پورا عقد ہی ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جیسے زید نے اپنے نابالغ بیٹے کو ایک مکان بطورِ تحفہ دیا اور یہ شرط عائد کی کہ جب تک وہ زندہ رہے گا اپنے بیٹے کے ساتھ اس مکان میں رہے گا اور سن بلوغت تک اس مکان کی مرمت میرے ذمّے رہے گی۔ ان شرائط کے ساتھ عقد تو درست ہو گیا مگر جو شرط مکان کی مرمت کی لگائی وہ فاسد ہو گی کیونکہ وہ شے اس کی ملک نہیں رہی تو لہٰذا اس کی مرمت کا ذمّے دار بھی مزید نہیں رہے گا۔ بعض اوقات یہ تصوّر کرلیا جاتا ہے کہ کوئی بھی معاملہ بغیر کسی تحریری ثبوت کے یا گواہان کی موجودگی کے بغیر طے نہیں پائے گا یا وہ معاملہ نافذ نہیں ہوسکے گا یہ بات محض غلط ہے تمام عقد زبانی کلامی ہی طے پاتے ہیں، جیسے عقد بیع خریدنے اور بیچنے والا موجود ہوتے ہیں جس میں قیمت ادا کرکے شے خریدی جاتی ہے تو کوئی تیسرا گواہ کے طور پر موجود ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر یہ تصوّر کہ اس کے بغیر یا تحریری ثبوت کے بغیر یہ عقد طے ہی نہیں ہو گا ایسی کوئی پابندی شرع مطہرہ عائد نہیں کرتی۔ مولانا احمد رضا فرماتے ہیں کہ: ''شرع میں تمام عقود صرف زبان سے ہی طے پاتے ہیں تحریر کوئی ایسی شے نہیں کہ اس کے بغیر کسی عقد کو نامکمل تصور کیا جائے۔ لہٰذا اگر ایک شخص نے اپنی بہن کو کوئی شے بطور تحفہ دی تو یہ عقد قائم ہو گیا اس مکان کی مالکہ ہندہ ہو گی۔'' ۸

کوئی بھی معاملہ قائم ہونے کے لیے شرعاً الفاظ نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جب تک وہ خاص الفاظ ادا نہ ہوں، صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ آیا کونسا عقد مراد ہے، جیسے زید نے زمین دیتے وقت کوئی لفظ ایسا استعمال نہیں کیا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہو کہ اس کا دینا تحفے کے طور پر تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ زمین اُدھار دی ہو لہٰذا ایسی صورتوں میں محض اندازے کی رو سے سمجھنا کہ یہ تحفہ ہے لہٰذا میری ملک میں ہے ناجائز ہے بلکہ خاص الفاظ ادا ہونے چاہیں کہ زید یہ کہے زمین میں نے تجھے بطورِ تحفہ دی یا یہ زمین تیری ہے جس کو دیا جائے اسی کی ملکیت مقصود ہو گی۔ ۹

جس کو بھی شے بطورِ تحفہ دی جائے اس کا عاقل وبالغ ہونا شرط ہے۔ دوسری صورت میں والد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ولی کی حیثیت رکھتا ہے جب بچہ نابالغ ہو تو اس صورت میں قبضہ دینے کا حق زائل ہو جاتا ہے۔ صرف باپ کا یہ کہہ دینا کہ میں نے یہ شے فلاں بیٹے کو ہبہ کی عقد نافذ و تمام ہو جاتا ہے۔

اسی طرح کوئی بھی شخص انہی تمام جائیداد صرف ایک ہی بیٹے کو بطورِ تحفہ دے تو وہی اس کا مالک ہو گا دیگر ورثا کو ان جائیدار سے رجوع کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ۱۰

تحائف کا واپس لینا

صدقہ، یا بطورِ تحفہ جب کسی دوسرے کو شے کا مالک بنادیا جاتا ہے تو دینے والے کی ملک سے وہ شے نکل جاتی ہے، لہٰذا یہ بات اخلاقی طور پر بھی ناپسندیدہ ہے کہ دینے والا دوبارہ اس سے اپنی دی گئی شے کا مطالبہ کرے اس ضمن میں احادیث مبارکہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بھی ثبوت ملتا ہے۔ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: ''اُس شخص کی مثال جو عطیہ دے کر پھر اس میں رجوع کرتا ہے اُس کتے کی طرح ہے جو سیر ہو کر کھاتا ہے پھر سیر ہو جانے کے بعد قے کرتا ہے اور اپنی قے میں رجوع کرتا ہے۔''

شرع مطہرہ نے کچھ شرائط کے تحت یہ عطیہ واپس لینے کی گنجائش نکالی، مولانا احمد رضا نے آٹھ شرائط اس ضمن میں درج کی ہیں۔ ان شرائط میں سے کمی کی صورت میں واپسی کسی طرح بھی ممکن نہیں، اگرچہ کوئی شخص اپنی شے واپس لے لے مگر گناہ ہر طرح سے ہو گا۔

(۱) وہ شخص جس کو عطیہ دیا جائے وہ اس شخص کا نسب کی رو سے رشتے دار نہ ہو۔

(۲) دونوں زوجین نہ ہوں۔

(۳) جس کو دیا جائے وہ فقیر نہ ہو۔

(۴) جس وقت دیا تھا اس کے بعد لینے والے نے اس شے کا کوئی عوض واپس نہ لوٹایا ہو۔ اگر کوئی شے یا قیمت ادا کردی کہ یہ تیرے تحفے کا

بدلہ ہے پھر رجوع کا اختیار نہیں۔
(۵) لینے والے کے پاس وہ شے ویسے ہی موجود ہو اُس سے کوئی زیادتی نہ ہوئی ہو جیسے تحفے کے طور پر دی گئی زمین میں مکان بنالیا، یا اس شے کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا اس کی قیمت بڑھ گئی تو واپسی کا اختیار نہیں۔
(۶) دینے والے کی ملک میں ہو۔
(۷) وہ شے موجود ہو ضائع نہ ہوئی ہو۔
(۸) دینے اور لینے والا دونوں زندہ ہوں۔

یہ وہ شرائط ہیں جن کے تحت دی گئی شے واپس لی جاسکتی ہے بصورت دیگر دینے والا اس حق سے دست بردار ہو چکا ہوتا ہے۔[۱۱]

قابلِ تقسیم شے کا ہبہ

ایسی اشیا جو کسی فردِ واحد کی ملکیت میں نہ ہوں بلکہ مشترکہ ہوں یا جس کے اور بھی وارثان موجود ہوں تو ایسی شے کو تحفے کے طور پر نہیں دیا جاسکتا۔ مولانا احمد رضا واضح کرتے ہیں کہ ایسی کسی بھی شے کو پہلے وارثان کے مابین تقسیم کرلیا جائے کہ ایک وقت میں مخصوص اور معینہ حصّے پر ہی دوسرے شخص کا قبضہ ممکن ہے۔ تقسیم کیے بغیر تحفہ دے بھی دیا جائے تو وہ لینے والی کی ملکیت نہیں، بلکہ دینے والی کی ملک میں ہی ہوتا ہے۔ اس میں کئی ایک صورتیں بیان کیں۔

اگر وہ شے قابلِ تقسیم نہ ہو اور کئی ایک لوگوں کو ہبہ کیا اس صورت میں وہ ہبہ نافذ ہو جائے گا زید کو شے میں رجوع کا حق نہیں ہو گا۔ دوسری صورت میں اگر وہ مکان ہو یا کوئی بھی شے جو ہبہ کی جائے تقسیم ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے اور زید نے چار لوگوں کو ہبہ کیا اور تقسیم کر کے مخصوص حصّے پر جُدا جُدا قبضہ کرادیا اور جن کو ہبہ کیا وہ صحیح اور نافذ ہو گا۔

اسی طرح ہبہ کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے شخص کا قبضہ کروایا جائے دوسری صورت میں وہ شے تقسیم نہ ہو جیسے ایک چھوٹی سے مکان دو شخصوں کے مابین مشترک ہوں آدھا کرنے کی صورت میں وہ انتفاع (فائدہ) کے قابل نہ رہیں ایسی اشیا کا بلا تقسیم کیے بھی قبضہ دلادینا کافی ہے۔ یہ تینوں صورتیں قبضۂ کاملہ کی ہیں۔[۱۲]

مرض الموت میں ہبہ

مولانا احمد رضا مرض الموت میں کیے جانے والے تحفے کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جو شخص قریب المرگ حکم جاری کرتا ہے شرع مطہرہ کا قاعدہ ہے کہ ایسے شخص کا کیا ہوا ہبہ اُس کے تہائی مال میں نافذ ہو گا باقی دیگر ورثا کے مابین تقسیم ہو گا۔ یعنی تہائی مال ہبہ ہو گا اور دو تہائی ورثہ کو دیا جائے گا۔[۱۳]

خلاصۂ تحقیق

دینِ اسلام نے معاشی نظام کی جو بنیادیں فراہم کیں انفرادی طور پر ان سب کا جائزہ لینے سے یہ بات منظر عام پر آتی ہے کہ اس دین نے معاشی اعتبار سے کمزور افراد کو بے سہارا نہیں چھوڑا، بلکہ جن لوگوں کے پاس مال کی کثرت ہے ان کو آزمائش میں مبتلا کیا کہ وہ اپنے سے کمزور افراد کا اس انداز سے خیال رکھیں کہ تمام افراد کم سے کم بنیادی ضرورتوں کو پوری کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ایسے افراد کو بغیر کسی عوض کے کچھ تحفے کے طور پر دینا احسن عمل ہے، بلکہ نیکی ہے۔ مولانا احمد رضا نے ہبہ اور تملیک کے متعلق تفصیلاً بیان کیا اور ہبہ میں رجوع کی آٹھ صورتوں کو واضح کیا اور ساتھ ہی ہبہ اور تملیک کا مفہوم بھی واضح انداز میں بیان کیا۔

نتائج

(۱) ایک منصفانہ عادلانہ معاشی نظام اُسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے اور ان کی اصل روح کو سمجھنے کی بھرپور سعی کی جائے۔
(۲) مولانا احمد رضا نے ہبہ اور تملیک کا تصوّر واضح انداز میں بیان کیا۔
(۳) کتاب الہبہ سے متعلق کئی ایسی متبادل صورتوں کی نشان دہی کی جو پہلے منظرِ عام پر نہ آئی تھیں۔

عملی اطلاق

گزشتہ سطور میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیثِ مبارکہ سے اس عقد کی اہمیت کا پتا چل گیا کہ تحفے تحائف سے انسانوں کے مابین حسد جیسے جذبات کی نفی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے دیے گئے ہدیے کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ وہ تصوّر تھا جو اسلام نے باہمی اخوّت و ہمدردی اور ایثار کے جذبات پروان چڑھانے کو دیا تھا کہ ہر انسان دوسرے انسان کی تکلیف اور درد کو محسوس کرے اور اخلاقی اعتبار سے اُس کی مدد کرے، چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہوں، جن میں ایک صورت مال کی بھی ہے۔

زکوۃ وصدقات تو ہر صاحبِ نصاب انسان پر فرض ہے۔ یہ تو ہر حال میں ادا کرنے ہیں؛ مگر دوسری طرف ہبہ کا معاملہ فرض نہیں، بلکہ اس میں آزادی دی گئی کہ مالی اعتبار سے طاقتور انسان اپنی حیثیت کے مطابق خوش دلی سے جس کو دینا چاہیں دیں سکیں۔ اس بارے میں مال کی کوئی حد مقرر نہیں کی، بلکہ اس میں بھی مال دار اشخاص کی فلاح کا تصوّر مضمر ہے کہ وہ خدا کے احکام کی خاطر کسی کو دیں تو وہ بھی نیکی شمار ہو گی۔ اس تصوّر کو اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرے میں غریب اور مفلوک الحال انسانوں کی کفالت کا مناسب بندوبست ہو سکے۔

مصادر و مراجع

۱۔ العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ (مع تخریج وترجمۂ عربی عبارات)، امام احمد رضا بریلوی، رضا فاونڈیشن، ج۱۹؛ اِشراق نُوری ترجمہ قدوری مترجم حاجی مقبول الرحمٰن، ص۱۹۸، مطبع لٹل سٹار، لاہور

۲۔ صحیح بخاری، امام محمد بن اسماعیل بخاری، کتاب الھبۃ وفضلھا والتحریض علیھا

۳۔ ایضاً

۴۔ بہارِ شریعت، مولانا امجد علی اعظمی، جلد دوم، ص۴۶، ضیاءالقرآن پبلی کیشنز، لاہور

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ (مع تخریج وترجمۂ عربی عبارات) امام احمد رضا بریلوی، ج۱۹، ص ۲۴۴

۸۔ ایضاً، ص۲۰۵

۹۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۱۱۔ ایضاً، ص۱۹۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲۲، ۲۰۷

۱۳۔ ایضاً، ص۲۲۷، ۲۳۰، ۲۳۹

(بقیہ صفحہ نمبر2 سے ملحق)

حضرت جنید: تو گویا تم نے قربانی بھی نہیں کی۔ اچھا! جب تم رمی جمار کر رہے تھے تو اس وقت تم نے اپنی خواہشات جو تم میں تھیں وہ بھی پھینکیں؟

حاجی: نہیں۔

حضرت جنید: تو گویا تم نے رمی بھی نہیں کی اور تم نے حج ہی نہیں کیا۔ واپس جا ایسا حج کر جو ہم نے تمہیں بتایا۔

حضرت علی ہجویری حج سے متعلق ایک اور واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ میں نے منیٰ میں ایک نوجواں کو دیکھا کہ آرام سے بیٹھا ہوا ہے اور لوگ قربانیوں میں مشغول ہیں۔ میں اسے دیکھتا رہا کہ کیا کرتا ہے اور وہ کون ہے اتنے میں وہ پکارنے لگا: خدایا! سب خلقت قربانیوں میں مشغول ہے اور میں بھی تیرے حضور اپنے نفس کو قربان کرنا چاہتا ہوں، مجھے قبول فرما۔ یہ کہا اور انگشتِ سبابہ سے حلق کے درمیاں اشارہ کیا اور گر پڑا تو جب میں نے دیکھا تو اسے مردہ پایا۔ (کشف المحجوب، ص۵۲۱ تا ۵۲۳)

جب حج کا مہینہ آتا ہے تو حجاجِ کرام کے لیے حج سے متعلّق رہ نمائی کرنے والی کتب تقسیم کی جاتی ہیں جن میں حج کی فضیلت، شرعی احکام، دعائیں اور زیارات سے متعلق خاصی معلومات فراہم کی جاتی ہے لیکن ان کتب کے مطالعے کے بعد حج کے صوفیانہ پہلو کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حجاجِ کرام کی رہنمائی کے لیے کتب میں حج سے متعلق صوفیانہ پہلو کو بھی شامل کر لیا جائے تاکہ حجاجِ کرام حج سے متعلق معلومات میں حجاج کے شرعی اور صوفیانہ پہلوؤں سے فیض یاب ہو کر حج کے تقاضوں کا عملی مظاہرہ کر سکیں۔

تحریکِ پاکستان میں مولانا شاہ احمد رضا اور اُن کے ہم عصر علما کی خدمات کا جائزہ

ڈاکٹر محمد حسن امام (وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی)

مولانا حکیم معراج الدین احمد امر تسری علیہ الرحمۃ

ولادت

مولانا حکیم معراج الدین احمد امر تسری رحمۃ اللہ علیہ ۷/اپریل ۱۸۸۶ء کو امر تسر بھارت کے مشہور و معروف طبیب حکیم محمد ابراہیم کے ہاں پیدا ہوئے۔ مڈل پاس کرنے کے بعد "بابائے طب حکیم غلام رسول امر تسری سے علومِ دینیہ حاصل کیے اور طب بھی پڑھی اور پھر والدِ گرامی کی زیرِ نگرانی مطب شروع کر دیا۔

مطب کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب کو علم و ادب سے بھی گہری دل چسپی رہی۔ ۱۹۰۴ء میں آپ نے اخبار "کامریڈ" جاری کیا، جس نے کانگرس کی اسلام دشمن پالیسی کو بے نقاب کر کے مسلمانانِ برّصغیر کی رہنمائی کی۔ اس کے بعد آپ نے ایک کتاب "کانگرس کا کچا چٹھا" لکھی جو بہت مقبول ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن چھپے۔ "اخبار" "تھبہ سوٹا" جاری کر کے آپ نے سکھوں فرقہ وارانہ تحریک "اکالی تحریک" کے خلاف محاذ قائم کر کے شاندار خدمات انجام دیں۔

صحافتی خدمات

مختلف مواقع پر آپ اخبار "ہنٹر"، "رفیقِ صادق"، حنفی اور "اخبارِ جماعت" کے ایڈیٹر رہے۔ اخبار "المعین" کی ادارت بھی کی۔ "المعین" میں ایک قابلِ اعتراض مضمون چھپنے پر حکومت نے ضمانت طلب کی۔ حکومت کی طرف سے اخبار ضمانت طلبی کا یہ پہلا وار تھا جو "المعین" سے شروع ہوا اور اب تک رائج ہے۔ احباب نے ضمانت کے لیے رقم کی پیشکش کی، مگر آپ نے حکومت کو ایک کوڑی تک دینا گوارا نہ کیا۔

ستمبر ۱۹۱۴ء میں آپ نے "انجمن راعیانِ ہند" کی بنیاد رکھی اور "راعین میگزین" کا اجرا کیا۔ ارائیں قوم کی تنظیم کے اس اوّلین داعی نے قوم کے لیے جو خدمات سر انجام دیں وہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ آپ کی کوششوں سے "انجمن راعیانِ ہند" کا سب سے پہلا اجلاس لاہور میں سر میاں محمد شفیع (۱۸۶۹ء۔ ۱۹۳۲ء) کی صدارت میں ہوا۔ اس عظیم الشان اجلاس میں علامہ محمد حسین عرشیؔ امر تسری (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۸۵ء) نے اپنی نظم میں حکیم صاحب کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

راہبر کون وہ سوتوں کو جگایا جس نے
جرسِ قافلۂ شوق بجایا جس نے
مژدۂ منزلِ مقصود سُنایا جس نے
مددِ قوم کا بیڑا ہے اُٹھایا جس نے
حاملِ کلفتِ ایثار جنابِ معراج
راہروِ جادۂ ابرار جنابِ معراج

اس اجلاس کی کامیابی نے برّصغیر میں پھیلی ہوئی "ارائیں قوم" کو متحرک کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے دیگر اقوام کے مقابلے میں سب سے پہلے "تاریخ ارائیاں" تصنیف کر کے ارائیں دوستی کا ثبوت فراہم کیا۔ قاضی فتح محمد امر تسری بھی آپ کی دریافت تھے، جنہوں نے لاہور کی انجمن راعیان کے تعاون سے ہفتہ وار "الراعی" جاری کیا۔

ارائیں قوم کی بیش بہا خدمات کے پیشِ نظر علامہ محمد حسین عرشیؔ امر تسری) ۱۸۹۲ء۔ ۱۹۸۵ء) نے آپ کو اپنی ایک نظم میں راعیون کا "سر سیّد" لکھا تھا۔ جب انجمن راعیان کی تنظیم و اشاعت کا کام لاہور والوں نے سنبھال لیا تو حکیم صاحب نے اپنی تمام تر توجہ دین و مذہب کی طرف مبذول کر لی۔

بیعت

آپ نے اوائل عمر میں ہی سنوسی ہند امیر ملّت حضرت پیر سیّد

حافظ جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۴۱ء۔۱۹۵۱ء) کے دستِ حق پرست پر بیعت کرلی تھی۔ بیعت کے بعد آپ اپنے زہدو تقویٰ، مذہبی و ملّی خدمات اور اطاعتِ مرشد کی بدولت حضرت امیر ملّت قدس سرّہٗ کے خاص مریدوں میں شمار ہونے لگے تھے حتیٰ کی فنا فی الشیخ کی منزل تک جا پہنچے۔

حضرت امیرِ ملّت قدس سرّہ کے خلیفۂ خاص مولانا غلام احمد اخگرؔ امر تسری رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۶۴ء۔۱۹۲۷ء) نے امر تسر سے اخبار ''الفقیہ'' جاری کرکے اہلِ سنّت و جماعت کی جو خدمات انجام دیں وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہیں، لیکن ایک ایسا وقت آیا کہ حضرت اخگرؔ کو مجبوراً یہ اخبار بند کرنا پڑا تو جولائی ۱۹۱۸ء میں مولانا اخگرؔ اور مولانا محمد شریف کوٹلوی[۱] (۱۸۶۱ء۔۱۹۵۱ء) کی تحریک پر حکیم صاحب نے اخبار الفقیہ کی ذمّے داریاں قبول کرلیں۔ اس پرچے کی ترتیب کا سارا کام مولانا اخگرؔ اور فقیہِ اعظم مولانا محمد شریف کوٹلوی فرماتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا اخگرؔ کی رحلت ہوئی تو علمائے امر تسری کا ایک وفد مولانا محمد عالم آسیؔ امر تسری رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۸۱ء۔۱۹۴۴ء) سے ملا اور درخواست کی کہ مولانا اخگرؔ کی رحلت سے الفقیہ کی علمی حیثیت ختم ہوگئی ہے لہٰذا آپ سرپرستی قبول فرمائیں۔ حضرت آسیؔ نے یہ ذمّے داری قبول فرمالی۔ چنانچہ مولانا آسیؔ اور حضرت حکیم محمد موسیٰ امر تسری ثم لاہوری کے برادرِ اکبر حضرت حکیم غلام قادر (۱۹۰۸ء۔۱۹۷۵ء) نے پرچہ کی ترتیب کا کام سنبھالا یعنی ان کے علمی معاون رہے اور یہ ایک ایسا پُرخلوص تعاون تھا کہ ان دونوں بزرگوں کا اخبار میں بحیثیتِ مدیر یا مدیرِ معاون کبھی بھی نام نہیں چھپا۔

ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت

حکیم صاحب نے اپنے پیر و مرشد حضرت امیر ملّت محدث علی پوری قدس سرّہٗ کی زیر قیادت تحریکِ خلافت میں بھرپور حصّہ لیا۔ لیکن وہ ہندو مسلم اتحاد کو مسلمانوں کے لیے انتہائی مہلک سمجھتے تھے جیسا کہ بعد میں حالات نے ثابت بھی کردیا۔ مولانا معراج الدین احمد اتسری نے کانگریسی مسلمان لیڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ہمارے دوستوں کو ابھی تک ''ہندو مسلم اتحاد'' کا شوق ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ ایسا اتحاد مسلمانوں کے لیے سم قاتل ہے۔ ملک کے ہندو لیڈر قومی میثاق کے متعلق جو رویّہ اختیار کر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ابھی '' انگریزی راج'' جب ''انگریزی راج'' میں ہندوؤں کے ظلم و ستم کا یہ حال ہے تو مسلمان یاد رکھیں کہ اگر سوراج مل گیا تو ہندو لوگ، مسلمانوں کو کان سے پکڑ کر ہندوستان سے باہر نکال دیں گے، یا اُن کی زندگی دشوار کردیں گے۔ اُردو زبان اور رسم الخط کا نام و نشان مٹا دیں گے اور تمام اسلامی حقوق غصب کر لیے جائیں گے۔''(۲)

حکیم صاحب ''جمعیت خدام الحرمین'' کے تاسیسی رُکن کی حیثیت سے تھے۔ جس کا پہلا اجلاس مورخہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو بریڈلاء ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں برّصغیر کے اکابر مثلاً پیر جماعت علی شاہ علی پوری (۱۸۴۱ء۔۱۹۵۱ء)، مولانا حسرتؔ موہانی (۱۸۸۱ء۔۱۹۵۱ء) مولانا سیّد حبیب مدیر ''سیاست'' لاہور (۱۸۹۱ء۔ ۱۹۵۱ء)، شیخ صادق حسن امر تسری (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۵۹ء)، سر میاں محمد شفیع (۱۸۶۹ء۔۱۹۳۲ء)، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۱۸۸۴ء ۔ ۱۹۶۳ء)، مولانا محمد بہاء الحق قاسمی امر تسری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۷ء) مہاراجہ محمود آباد علی محمد خان (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۳۱ء) نے شرکت کی۔ حکیم صاحب نے اس اجلاس کی کامیابی و کامرانی کے لیے سعیِ بلیغ کی۔

حکیم صاحب کو دو دفعہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ امر تسر کے سانحے پر گرفتار ہوئے اور دوسری دفعہ ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات میں پابہ زنجیر ہوئے مگر یہ گرفتاریاں، زندانیاں اور پریشانیاں اُنہیں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل سے باز نہ رکھ سکیں۔

۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو حکیم صاحب نے ''الفقیہ'' کے صفحات تحریکِ پاکستان کے کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے وقف کردیے۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا سنی کانفرنس کی خبریں نمایاں طور پر شائع کرکے اور تحریکِ پاکستان کے حق میں اداریے لکھ کر تحریک کو تقویت بخشی۔ حضرت امیر ملّت محدث علی پوری قدس سرّہٗ کے اس مرید نے قیامِ پاکستان کے سلسلے

میں جو بے مثال خدمات انجام دیں۔ ''الفقیہ'' کی فائلیں آج بھی ان کی گواہی دے رہی ہیں۔

۴۶۔۱۹۴۵ء کے تاریخ ساز الیکشن میں حکیم صاحب نے قیامِ پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد ''الفقیہ'' کے ذریعے جو کردار ادا کیا وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں جب خضر حیات ٹوانہ (المتوفّٰی۔ ۱۹۷۵ء) نے مسلم لیگ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر استعفا دے دیا تو اس معرکے میں بھی ''الفقیہ'' کی خدمات درخشاں ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد حکیم صاحب سب کچھ چھوڑ کر لاہور تشریف لے آئے۔ ۲/ جنوری ۱۹۴۸ء کو ''الفقیہ'' کے اجرا کے لیے درخواست دی۔ ۲۰/ جولائی کو ڈیکلریشن مل گیا اور پرچہ شائع ہونے لگا۔ بعد ازاں بعض ناگزیر حالات کی بنا پر حکیم صاحب ''الفقیہ'' کو گوجرانوالہ لے گئے اور ان کی حیات تک ''الفقیہ'' بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔ اُن کی رحلت کے بعد اُن کے صاحبزادے نے ۷/ اپریل ۱۹۴۹ء کو لاہور سے نئے سائز پر اس کا اجرا کیا، مگر اب چونکہ پرچے میں حکیم صاحب والی بات نہ تھی لہٰذا جلد ہی دم توڑ گیا۔

وفات

حکیم صاحب کی وفات حسرتِ آیات ۹/ نومبر ۱۹۴۸ء مطابق ۷/ محرم الحرام ۱۳۶۸ھ بروز منگل بوقت شام ۵ بج کر ۳۵ منٹ پر بعمر ۶۲ سال لاہور میں ہوئی۔ امرتسر میں لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر آنے والے اس مردِ جلیل کو پاکستان میں سر چھپانے کے لیے جگہ نہ مل سکی، اگر ملی تو صرف قبر کے لیے دو گز زمین! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ قبرستانِ میانی صاحب لاہور میں دفن ہوئے۔ ۱۴/ اگست ۱۹۹۶ء کو ''تحریکِ پاکستان ورکرز ٹرسٹ لاہور'' نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل'' دیا جو اُن کے صاحبزادے فیاض الدین احمد نے وصول کیا۔ (۳)

مولانا محمد شفیع داؤدی علیہ الرحمۃ

مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۷۹ء میں داؤد نگر ضلع مظفر پور (صوبہ بہار، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل بی کیا۔ کلکتہ ہائی کورٹ اور پٹنہ ہائی کورٹ میں کامیاب وکالت کی۔ دینی علوم پر بھی اچھی خاصی نظر تھی۔ مظفر پور میں ''شفیع منزل'' کے نام سے ایک شاندار رہائش گاہ تعمیر کی جس میں تازیست رہائش پذیر رہے۔

تحریکِ خلافت میں حصّہ

مولانا محمد شفیع داؤدی نے تحریکِ خلافت میں بھرپور حصّہ لیا اور اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ علی برادران کے خاص الخاص مخلصین میں سے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں ''بہار، اڑیسہ خلافت کانفرنس'' کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں سینٹرل اسمبلی کے ممبر چُنے گئے۔ فروری ۱۹۲۷ء میں ''آل انڈیا خلافت کانفرنس'' کے اجلاس لکھنؤ کی صدارت کی۔ ''تحریکِ ترکِ موالات'' میں وکالت چھوڑ کر نیم فقیرانہ لباس زیب تن کر لیا۔ اس وقت تین ہزار روپے ماہوار کی آمدنی تھی۔ اس تحریک میں قلندرانہ کردار ادا کرنے کی پاداش میں ۱۹۲۰ء میں دفعہ ۱۰۸ تعزیراتِ ہند کے تحت آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ نے ضمانت نہ دی اور نتیجتاً ایک سال کے لیے قید و بند کی تکالیف برداشت کرتے رہے۔

اس گرفتاری کے لیے انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس جب ''شفیع منزل'' پہنچا تو تین چار سیڑھیاں چڑھ کر ہی مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں لڑکھڑا گیا۔ یہ مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور حُبِّ قومی کا رُعب تھا، جس نے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وارنٹ گرفتاری بھی بمشکل دکھا سکا۔ مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے بڑی فراخ دلی سے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ وہ ساتھ چلنے کو تیار ہیں، گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مسلم لیگ نے دہلی اجلاس (۱۹۲۶ء) میں آئینی اصلاحات کے لیے اسکیم وضع کرنے کی خاطر جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے فروری ۱۹۲۷ء کے شروع میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی رہائش گاہ ویسٹرن کورٹس دہلی (انڈیا) میں اپنی میٹنگ بلائی۔ مسلم لیگ کی ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کی قراردادوں میں جن مطالبات اور تحفظات کا تعیّن کیا گیا تھا ہندو لیڈر اُنہیں قبول کرنے میں متامل تھے۔ وہ بدستور مخلوط طریقِ انتخاب پر مصر رہے۔ اس لیے کمیٹی نے ایک ایسا فارمولا

تیار کرنے کی سعی کی جو اُنہیں قابل قبول ہو۔ جوں جوں کمیٹی کی میٹنگز ہوتی رہیں ان کی اہمیت بڑھتی گئی۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مباحثوں میں حصّہ لینے کے لیے دوسرے لیڈروں کو بھی مدعو کیا۔ ایسی آخری میٹنگ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو قائدِ اعظم محمد علی جناح کی زیرِ صدارت ہوئی، جس میں درج ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء)، سر محمد شفیع (۱۸۶۹ء۔۱۹۲۳ء)، نواب محمد اسماعیل خاں (۱۸۸۳ء۔۱۹۵۸ء)، سر محمد یعقوب خاں (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۲ء)، میاں شاہ نواز (۱۸۷۵ء ۔ ۱۹۳۸ء)، صاحبزادہ عبدالقیوم خاں آف سرحد (۱۸۶۴ء ۔ ۱۹۳۷ء)، نواب ذوالفقار علی خاں (۱۸۷۶ء۔۱۹۳۳ء)، عبداللہ سہروردی (۱۸۸۳ء۔۱۹۳۵ء)، مہاراجہ علی محمد خاں محمود آباد (۱۸۸۱ء۔۱۹۳۱ء)، عبدالمتین چوہدری (۱۸۹۵ء۔۱۹۴۸ء)، امام صاحب جامع مسجد دہلی اور مولانا محمد شفیع داؤدی۔

اس اجلاس میں سندھ کو الگ صوبہ بنانے، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کرنے اور بنگال میں مسلمانوں کو قانون ساز مجالس میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینے اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی اکثریت مقرر کرنے کے مطالبات کیے گئے تھے۔ ان تجاویز کو "تجاویزِ دہلی" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، دوسرے رہنماؤں کے علاوہ مولانا محمد شفیع داؤدی علیہ الرحمۃ نے بھی اس پر دستخط کیے تھے۔

مولانا محمد شفیع داؤدی علیہ الرحمۃ نے اس اجلاس میں سرگرمی سے حصّہ لیا اور اس کی کامیابی کے لیے سعیِ بلیغ فرمائی۔ تجاویز کی تیاری میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

۲۵ اگست ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس کا جلسہ لکھنؤ میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا محمد شفیع داؤدی رُکن مرکزی مجلس قانون ساز (ممبر سینٹرل اسمبلی) نے زور دیا کہ وہ تجاویز جو دہلی میں مسلمانوں نے ۱۹۲۷ء میں بنائی تھیں اور جن کو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے منظور کرلیا ہے ان کو نہرو رپورٹ میں شامل کیا جائے؛ لیکن ڈاکٹر انصاری اور اُن کے ساتھی کانگرسیوں نے انکار کردیا۔ مولانا محمد شفیع داؤدی علیہ الرحمۃ ہندوؤں اور کانگرسی مسلمانوں کی ہٹ دھرمی سے مایوس ہو کر رنجیدہ واپس ہوئے۔

۴ ستمبر ۱۹۲۸ء کو شملہ میں سینٹرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ وہاں پنڈت موتی لعل نہرو (۱۸۶۱ء۔۱۹۳۱ء) نے کوشش کی کہ اسمبلی میں اپنی تجاویز ریزولیشن کے ذریعے منوالیں۔ اپنی پارٹی کے ایک ممبر گنگا نند سنہا سے ریزولیشن کا نوٹس دلوادیا جو بیلٹ میں آکر اس کے لیے تاریخ مقرر ہوگئی۔ مولانا محمد شفیع داؤدی جو لکھنؤ سے دل برداشتہ ہو کر آئے تھے اور نہرو رپورٹ کے زبردست مخالف تھے۔ اُنہوں نے اپنی پارٹی "خلافت کمیٹی" کے ممبروں سے مشورہ کیا اور دیگر ممبروں کے سامنے ذکر کیا تو سب نے طے کیا کہ تمام مسلمانوں کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد کی جائے جس کی صدارت کے لیے سر آغا خاں (۱۸۷۷ء۔۱۹۵۷ء) کو لندن سے بلایا جائے۔ ۳۸ مسلمان ممبران اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ نے یہ تجویز منظور کرکے دستخط کردیے۔

اس کانفرنس کے بلانے والے جن ممبران نے دستخط کیے ان کے صوبے وار نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) صوبہ پنجاب

نواب سر ذوالفقار علی خاں (۱۸۷۶ء۔۱۹۳۳ء)، سر عبدالقادر (۱۸۷۴ء۔ ۱۹۵۰ء)، میاں شاہ نواز (۱۸۷۵ء۔۱۹۳۸ء)، لیفٹیننٹ سردار محمد نواز خاں (۱۹۰۱ء ۔ ۱۹۶۸ء)، میاں عبدالحی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۴۶ء)، سیّد راجن شاہ گیلانی ملتانی (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۶ء)۔

(۲) صوبہ متحدہ (یوپی)

مولوی محمد یعقوب (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۲ء)، نواب محمد اسمٰعیل خاں (۱۸۳۸ء۔۱۹۵۸ء)، سر محمد یامین خاں (۱۸۸۶ء۔۱۹۶۶ء)۔

(۳) صوبہ بنگال

عبداللہ سہروردی (۱۸۸۳ء ۔ ۱۹۳۵ء)، عبدالحلیم غزنوی (۱۸۷۶ء ۔ ۱۹۵۳ء)، محمد رفیق، حاجی چوہدری محمد اسمٰعیل خاں (س۔م۔ن)، انوارالعظیم (س۔م۔ن)، عبدالمتین چوہدری (۱۸۹۵ء۔۱۹۴۸ء)، محمود سہروردی (س۔م۔ن)۔

(۴) صوبہ بہار

مولانا محمد شفیع داؤدی (۱۸۷۹ء ۔ ۱۹۴۹ء) نواب زادہ سیّد اشرف الدین (س۔م۔ن) بدیع الزمان (س۔م۔ن)۔

(۵) صوبۂ سندھ

حاجی عبداللہ ہارون (۱۸۷۲ء۔ ۱۹۴۲ء)، محمد پناہ خاں (س۔م۔ن)، وحید بخش بھٹو (س۔م۔ن)۔

(۶) صوبۂ بمبئی

سر ابراہیم ہارون (المتوفّٰی۔ ۱۹۳۵ء)، فاضل ابراہیم رحمت اللہ (س۔م۔ن)۔

(۷) صوبۂ مدراس

مولوی سیّد مرتضیٰ (س۔م۔ن)، عبداللطیف فاروقی (س۔م۔ن)۔

(۸) صوبۂ سرحد

صاحبزادہ نواب سر عبدالقیوم خان (۱۸۶۴ء۔ ۱۹۳۷ء)۔

(۹) صوبۂ سی پی

عبدالقادر صدیقی دوبارہ ۲۲ ستمبر کو اعلان کیا گیا کہ ۱۱ نومبر (۱۹۲۸ء) کو دہلی میں سر آغا خاں کی زیرِ صدارت جلسے میں نہرو رپورٹ پر غور ہوگا۔

جب موتی لعل نہرو نے دیکھا کہ اسمبلی میں مسلمان ممبر اُس رپورٹ کی مخالفت کریں گے تو اس کی وقعت کی کہ وہ متفق علیہ ہے جاتی رہے گی اور لارڈ برکن ہیڈ (Lord Birken Head) کا چیلنج دُرست ہوجائے گا کہ ہندوستان کی سب قومیں مل کر کوئی آئین نہیں بنا سکتیں لہٰذا دور اندیش پنڈت نے اپنے ممبر کمار گنگا نند سنہا کو اسمبلی سے غائب کر دیا اور جس وقت اس کا نام پکارا گیا کہ ریزولیشن پیش کرے وہ غائب تھا۔ اس طرح پنڈت موتی لعل نہرو اپنی رپورٹ جس میں مسلمانوں کی خوب کھل کر حق تلفی کی گئی تھی پاس کرانے سے رہ گئے۔ اس کا سہرا مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ کے سر ہے۔

یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو سر آغا خاں کی صدارت میں دہلی میں "آل پارٹیز مسلم کانفرنس" کا جلسہ ہوا جس میں پانچ ہزار نمائندہ مسلمان شامل ہوئے۔ نہرو رپورٹ کی بڑی سخت اور شدید مذمت کی گئی اور دیگر مسلم مفاد قرار دادیں بھی منظور کی گئیں۔ تائید کرنے والوں میں مولانا آزادؔ سبحانی (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۵۷ء) اور مولانا عبدالماجد بدایونی (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۳۱ء) کے علاوہ مولانا محمد شفیع داؤدی بھی شامل تھے۔ مولانا محمد شفیع داؤدی نے اس کانفرنس کے سیکریٹری کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

۱۹۲۹ء میں جب جمعیت علماءِ ہند مکمل طور پر کانگرس کی گود میں جاگری اور مسلم مفادات کو بالکل نظر انداز کر دیا تو علمائے حق، جن میں مولانا محمد علی جوہرؔ (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۱ء)، مولانا عبدالماجد بدایونی (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۳۱ء)، مولانا نثار احمد کانپوری (۱۸۸۰ء۔ ۱۹۳۴ء)، مولانا عبدالکافی الٰہ آبادی (۱۸۵۸ء۔ ۱۹۳۰ء)، مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی، مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۵۴ء)، شاہ محمد سلیمان پھلواروی (۱۸۵۹ء۔ ۱۹۳۵ء)، میر غلام بھیک نیرنگؔ (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۵۲ء)، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۳۹ء)، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۴۱ء)، مولانا سیّد حبیب ایڈیٹر "سیاست" لاہور (۱۸۹۱ء۔ ۱۹۵۱ء)، پیر غلام مجدّد سرہندی (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۵۸ء)، مولانا حسرتؔ موہانی (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۵۱ء)، مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (۱۸۹۳ء۔ ۱۹۵۴ء)، مولانا نذیر احمد خجندی، مولانا عبدالرؤف دانا پوری (۱۸۷۴ء۔ ۱۹۴۸ء) وغیرہم شامل تھے، کے ساتھ مولانا محمد شفیع داؤدی نے بھی جمعیت علماءِ ہند کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا اور جمعیت علماءِ کانپور کی تشکیل کی، جس کے صدر مولانا محمد علی جوہرؔ اور سیکریٹری مولانا مظہر الدین شیر کوٹی منتخب ہوئے۔ نیز ۵؍ دسمبر ۱۹۲۹ء کو "دی مدراس پریذیڈنسی مسلم کانفرنس، مدراس" کی صدارت کی۔

مسلم لیگ میں شمولیت و جدوجہد

اسی سال مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کے مفادات کے حصول کی جنگ میں تن من دھن کی بازی لگادی اور پھر تازیست اسی نصب العین پر اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کی حمایت پر جمعیت علماءِ ہند کو خوب تنقید کا نشانہ بنایا۔ ۲۵، ۲۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ زیرِ صدارت خان بہادر حافظ ہدایت حسین بیرسٹر ایٹ لاء آف کانپور (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۳۶ء) ہوا، جس میں صوبوں اور ریاستوں سے تین سال کے لیے مسلم لیگ کے نائب صدور چُنے گئے۔ صوبۂ بہار کی طرف سے مولانا محمد شفیع داؤدی کو تین سال ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا نائب صدر چُنا گیا۔ اس اجلاس میں مولانا محمد شفیع داؤدی نے

جمعیت علماءِ ہند پر بوجہ حمایتِ "آل انڈیا نیشنل کانگرس کڑی تنقید کی اور ایک قرار داد پیش کی جس میں کمیونل ایوارڈ کے مخالفین کی مذمت کی گئی۔

۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس انعقاد پذیر ہوئی۔ ۱۲/ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں جارج پنجم (۱۸۶۵ء۔۱۹۳۶ء) نے پہلی گول میز کانفرنس کا افتتاح کیا۔ ۱۲/ نومبر ۱۹۳۰ء تا ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء یہ کانفرنس جاری رہی۔ اس وقت گاندھی جی (۱۸۶۹ء۔۱۹۴۸ء) جیل میں تھے۔ ہندو قوم نے اپنی روایتی دوہری چال کا مظاہرہ کرتے ہوئے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کانگرس کے بائیکاٹ کے باوجود مہاسبھا کے نمائندے ہندو ذہنیت کی ترجمانی کے لیے موجود تھے۔ باقی تمام جماعتیں بھی اس میں شریک تھیں۔ مسلمانوں کے نمائندوں میں قائدِ اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء)، مولانا محمد علی جوہرؔ (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء)، مولوی اے کے فضل الحق (۱۸۷۳ء۔۱۹۶۲ء)، غلام حسین ہدایت اللہ (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۸ء)، سر میاں محمد شفیع (۱۸۶۹ء۔۱۹۳۲ء)، حافظ ہدایت حسین (۱۸۸۱ء۔۱۹۳۶ء)، سر شفاعت احمد خاں (۱۸۹۳ء۔۱۹۴۷ء)، سر آغا خاں (۱۸۷۷ء۔۱۹۷۳ء)، نواب احمد سعید چھتاری (۱۸۸۸ء۔۱۹۸۲ء)، نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خاں (۱۸۶۴ء۔۱۹۳۷ء)، سر سلطان احمد (۱۸۸۰ء ۔ ۱۹۶۳ء)، میاں شاہ نواز (۱۸۷۵ء ۔ ۱۹۳۸ء)، راجہ شیر محمد (س۔م۔ن)، بیگم شاہ نواز (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۹ء) وغیر ہم شامل تھے۔

گول میز کانفرنس کا دوسرا دور ۷/ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء جاری رہا۔ اس میں گاندھی جی، کانگرس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ مسلم وفد میں اب مولانا شوکت علی (۱۸۷۲ء۔۱۹۳۸ء)، سر علی امام (۱۸۶۹ء ۔۱۹۳۲ء) اور مولانا محمد شفیع داؤدی بھی شامل ہوگئے۔ گاندھی کی زبردست خواہش کے باوجود ابو الکلام آزادؔ (۱۸۸۸ء ۔ ۱۹۵۸ء) اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰ء ۔ ۱۹۳۶ء) کو اس اجلاس میں شریک نہ کیا گیا۔ گاندھی نے انگلستان روانہ ہونے سے پہلے کراچی میں اقلیتی اُمور کے بارے میں ایک فارمولا پیش کر دیا، جس میں تین نکات، مخلوط انتخاب، نشستوں کا تعین اور ۲۵ فیصد سے کم آبادی والی اقلیت کے لیے عمومی نشستوں سے انتخاب لڑنے کا حق شامل تھے۔ کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا تو گاندھی نے اپنے علاوہ کسی اور کو ہندوستان کا نمائندہ ماننے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ "کانگرس ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور میں اس کا واحد نمائندہ۔" اس نے کوشش کی کہ اقلیتی اُمور پر تصفیے کو ملتوی کر کے دستور کی باقی شقیں طے کر لی جائیں، مگر اس کی ایک نہ چلی۔ کانفرنس میں اس کی غیر معقولیت بالکل بے نقاب ہوگئی۔ واپس آکر گاندھی نے تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ گاندھی کو پہلی مرتبہ مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود تحریک چلانے کا اتفاق ہو رہا تھا؛ بدیں وجہ تحریک بہت جلد فیل ہوگئی۔

کانفرنس میں گاندھی کی ناکامی اور واپس آنے پر تحریک چلانے کی مذموم کوشش آور نہ ہونے پر اُسے جو ہزیمت اُٹھانا پڑی، اس سے کانگرس کو سخت دھچکا لگا۔ برطانوی وزیرِ اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ (۱۸۶۶ء۔ ۱۹۳۶ء) نے ۱۴/ اگست ۱۹۳۲ء کو فیصلہ سُنا دیا، جس کے اہم نکات یہ تھے:

(۱) جداگانہ انتخاب کا حق صرف مسلمانوں ہی کو نہیں، تمام اقلیتوں کو دے دیا گیا۔

(۲) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ۱/ ۳ نشستیں دی گئیں۔

(۳) صوبائی مجالس میں اقلیتوں کو اپنے تناسب سے قدرے زیادہ نشستیں دے دی گئیں۔

اس تمام تگ و دو میں مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں مسلمانوں کے مفاد کے لیے وقف کر کے مسلم وفد اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اور اپنے گراں قدر مشوروں اور کوششوں سے گاندھی کے مکر و فریب کے جال کو تار تار کیا۔ ہندو ذہنیت پر مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ کی گہری نظر تھی۔

"مولانا محمد شفیع داؤدی رحمۃ اللہ علیہ بہت صابر اور ہوش گوش کے آدمی ہیں؛ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ان کے صوبے بہار میں "کانگرس کمیٹی" آئندہ مہاسبھا کا مکمل روپ دھاران کرے گی اور یہ کہ وہاں کیا بُرا انجام ہوگا۔"(۴)

۱۹ فروری ۱۹۳۳ء کو مولانا محمد شفیع داؤدی نے "ایگزیکٹو بورڈ آل پارٹیز مسلم کانفرنس" کے اجلاس پر غور کیا۔ اس میں پندرہ قرار دادیں منظور کی گئیں۔ مولانا محمد شفیع داؤدی نے بحیثیت سیکریٹری اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے بڑی محنت اور تگ و دو کی۔

۲۴ ر ستمبر ۱۹۳۴ء کو "مسلم یونٹی بورڈ" نے اپنے اجلاس مراد آباد میں جمعیت علماء ہند (دہلی) کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا کہ بورڈ شریعت کے معاملات میں جمعیت کا مشورہ قبول کرے گا تو اس پر جمعیت علما (کانپور) کے سیکریٹری مولانا مظہر الدین شیر کوٹی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۳۹ء) نے اس کی تردید کردی اور ساتھ ہی اپنی جمعیت کا اجلاس طلب کرلیا، جس میں شاہ محمد سلیمان پھلواروی (۱۸۵۹ء۔۱۹۳۵ء)، حکیم الامت علامہ اقبال(۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء)، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی(۱۸۸۸ء۔ ۱۹۴۱ء)، مولانا سیّد حبیب مدیر "سیاست" لاہور(۱۸۹۱ء۔۱۹۵۱ء)، مولانا عبدالحامد بدایونی(۱۸۹۸ء۔ ۱۹۷۰ء) و دیگر بہت سے علماءِ کرام کے علاوہ مولانا محمد شفیع داؤدی نے بھی شرکت کی اور اپنی گراں قدر تجاویز و آرا سے اجلاس کو نوازا۔ اجلاس میں "مسلم یونٹی بورڈ" کی حمایت کا فیصلہ ہوا اور جمعیت علماءِ ہند سے بالکل علیحدگی اور لاتعلقی کا اعلان کیا گیا۔

۲۱ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو بدایوں میں "آل انڈیا مسلم پولٹیکل کانفرنس" انعقاد پذیر ہوئی، جس کی صدارت کا شرف مولانا محمد شفیع داؤدیؒ کو حاصل ہوا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں بھرپور دل چسپی اور طوفانی دورے کرنے کی وجہ سے مولانا محمد شفیع داؤدی کی صحت بہت متاثر ہوئی اور وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے، مگر اُن کی تمام تر ہمدردیاں بدستور مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہیں۔

۱۹۴۵، ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں اُنھوں نے مسلم لیگی اُمیدواروں کی کامیابی کے لیے مقدور بھر مساعی کیں۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں کل ہند مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا تو صوبۂ بہار کی تین مسلم نشستوں پر مسلم لیگ نے شان دار کامیابی حاصل کی۔ پہلی نشست پر خان بہادر حبیب الرحمٰن (مسلم لیگ) نے ۱۲۳۳۴ ووٹ حاصل کیے جب کہ ان کے مدِّ مقابل عبدالغفور (قوم پرست) کو صرف ۲۴۳ ووٹ ملے اور ضمانت ضبط ہوگئی۔ حلقہ نمبر ۲ بھاگلپور و حلقہ نمبر ۳ ناگپور، اڑیسہ سے علی الترتیب مسلم لیگی اُمیدوار عابد حسین اور محمد نعمان بلا مقابلہ کامیاب ہوگئے۔

فروری ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں بہار اسمبلی کی کل ۴۰ مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ نے ۳۴ نشستیں حاصل کرکے ۸۵ فیصد کامیابی حاصل کی۔ مولانا محمد شفیع داؤدی کے رہائشی حلقہ مظفر پور صدر (حلقہ نمبر ۱۹ پر مسلم لیگ کے جناب تجمل حسین کا مقابلہ کانگرس کے منظور حسن اور آزاد اُمیدوار عبدالجبار سے تھا۔ کانگرسی اُمیدوار نے ۹۸۸ آزاد اُمیدوار نے ۱۸ ووٹ حاصل کیے۔ مؤخر الذکر کی تو ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔ مسلم لیگی اُمیدوار نے ۴۰۰۵ ووٹ لے کر شان دار فتح مندی پائی۔

وفات

۱۹۴۶ء میں مولانا محمد شفیع داؤدی کی علالت نے شدت اختیار کرلی اور وہ بہت کمزور ہوگئے۔ ضعفِ پیری کے باعث نقل و حرکت محدود ہوکر رہ گئی۔ مسلمانوں کا درد جو اُن کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا وہ بدستور موجود تھا۔ جب کہیں سے سُن لیتے کہ مسلمانوں کو دُکھ پہنچا ہے تو بیتاب ہوجاتے۔ آخر کار تین سال کی طویل علالت کے بعد ۱۹۴۹ء میں مولانا محمد شفیع داؤدی نے مظفر پور (بھارت) میں اپنی جاں، جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

محترمہ زبیدہ خاتون

جدوجہدِ آزادی میں مولانا محمد شفیع داؤدی کی اہلیہ زبیدہ خاتون نے بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ زبیدہ خاتون کی ولادت اکتوبر ۱۸۸۵ء میں پارو گاؤں ضلع مظفر پور (بہار، بھارت) میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سیّد عبدالفتح ایڈووکیٹ تھا جو پارو گاؤں کے قرب و جوار میں بڑی زمینوں کے مالک تھے۔ زبیدہ خاتون نے اپنے شوہر کے سیاسی نظریات کا اثر قبول کرکے سیاست میں قدم رکھا۔ تحریکِ خلافت کے دور میں علی برادران کی والدہ محترمہ بی اماں، مولانا محمد شفیع داؤدی کے ہاں قیام پذیر ہوئیں تو زبیدہ بیگم خصوصی طور پر متاثر ہوئیں اور پھر بی اماں کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔ اور ہر قسم کی پریشانیوں کا مقابلہ کیا۔ پردہ نشین خاتون ہونے کے وجود اپنے شوہرِ نام دار کے ساتھ ہر جلسے میں شریک ہوتیں، خود بھی خواتین کے جلسے کرتیں اور اُن تمام خواتین کا حوصلہ بڑھانے میں ہر ممکن مدد کرتیں جن کے شوہر یا عزیز و اقارب قید و بند میں ہوتے۔

تحریکِ عدمِ تعاون کے سلسلے میں جن طلباء نے گورنمنٹ اداروں سے اپنے نام کٹوالیے تھے اُن کی تعلیم کے لیے مولانا محمد شفیع داؤدی نے اپنی کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں قومی اسکول اور کالج قائم کیے تھے۔ روپیہ فراہم کرنے کی خاطر محبِّ وطن خواتین کھانا پکانے سے قبل ایک مٹھی آٹا بچالیا کرتی تھیں۔ زبیدہ خاتون طلباء کی غذا و صحت کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ خصوصاً ان کا کھانا وہ اپنی نگرانی میں تیار کرتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے جنھوں نے خود گورنمنٹ ادارے سے اپنی تعلیم منقطع کرلی تھی میزبانی کے فرائض انجام دیتے تھے، لیکن مالی مشکلات اور حکومت کی طرف سے مستقل پریشان کیے جانے کے سبب یہ ادارے زیادہ عرصے تک نہ چل سکے۔

مولانا محمد شفیع داؤدی کی تین سالہ طویل علالت کے دوران زبیدہ خاتون ان کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ زبیدہ کو اپنا رہائشی مکان کرائے پر دے کر ایک مختصر مکان میں کرائے پر رہنا پڑا۔ گزر بسر کی خاطر زمینیں بھی فروخت کیں، مگر حکومتِ ہند کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔

شوہر کی رحلت کے بعد کراچی (پاکستان) آگئیں اور پھر زندگی گوشہ نشینی میں گزار کر ۲۰ جون ۱۹۷۰ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ گلشنِ اقبال کراچی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔(۵)

مولانا سیّد حبیب اللہ شاہ

مولانا سیّد حبیب اللہ شاہ بن سیّد سعد اللہ شاہ (۱۸۵۵ء۔ ۱۹۴۵ء) کی ولادت ۵/ستمبر ۱۸۹۱ء کو جلالپور جٹیاں ضلع گجرات (صوبہ پنجاب) میں ہوئی۔ مشن ہائی اسکول وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ سے میٹرک کیا۔(۶) مختلف اساتذہ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴ء سے پہلے شمس العلما مولوی سیّد محمد ممتاز علی (۱۸۶۰ء ۔۱۹۳۵ء) کے دارالاشاعت پنجاب لاہور سے بطور کلرک ملازمت کا آغاز کیا۔ اور پھر ماہنامہ "پھول" اور "تہذیب" کے ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں مشہور کشمیری مورخ منشی محمد دین فوق (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۴۵ء) کے "کشمیری میگزین" سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے بعد فوج کے کسی محکمے میں بھرتی ہوکر شنگھائی (چین) چلے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں فوج کی ملازمت سے سبک دوش ہوکر کلکتے پہنچے اور اخبار "رسالت" میں ملازمت اختیار کرلی۔ بعد ازاں اپنا ذاتی اخبار "ترمذی" کے نام سے جاری کیا۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ پنجاب میں گورنر سر مائیکل اڈواٹر (۱۸۶۴ء ۔ ۱۹۴۰ء) کی سخت گیری کے باعث اخبارات بند ہوچکے تھے اور یہاں کے لوگوں کو جنگ کی خبروں کے لیے دوسرے صوبوں کے اخبارات دیکھنے پڑتے تھے۔ اس طرح "ترمذی" بھی لاہور میں بکنے لگا۔ "ترمذی" کے پنجاب میں داخلے پر پابندی لگی تو "رہبر" جاری کیا، اس کا داخلہ بند ہوا تو "نقاش" نکال لیا۔ اس کے بعد لاہور آکر ۱۹۱۹ء میں روزنامہ "سیاست" نکالا جو ۱۹۳۷ء تک باقاعدگی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوتا رہا۔

سیّد حبیب صحافی بھی تھے اور قومی رضاکار بھی۔ چنانچہ جب کوئی تحریک اُٹھتی تو اس میں آپ کا جو کردار ہوتا، اس کی عکاسی ان کے اخبار "سیاست" میں ہوتی۔ آپ کو مشائخ عظام خصوصاً سنوسیِ ہند امیر ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری (۱۸۴۱ء۔ ۱۹۵۱ء) کا تعاون اور سرپرستی حاصل تھی۔ آپ اعلیٰ درجے کے اخبار نویس، بہت اچھے مقرر اور اسلامی تاریخ سے خوب واقف تھے۔ شعر و شاعری سے بھی اچھا خاصا لگاؤ تھا۔ "بھگوت گیتا" کا منظوم ترجمہ یادگار ہے۔ زندگی کا بیشتر حصّہ لاہور میں گزرا۔ نہایت محنتی، جفاکش، باہمت، دوستوں کے مخلص دوست اور دشمنوں کے سخت دشمن تھے۔ بڑے سے بڑے آفیسر اور لیڈر سے ٹکرا جانے میں تامل نہ کرتے تھے۔

آپ کا اخبار مسلم رائے عامّہ کا ہم نوا تھا۔ مسلمانوں نے جب بھی کسی مسئلے پر آواز بلند کی، "سیاست" نے بھرپور انداز سے حقیقی کردار ادا کیا اور ملتِ اسلامیہ کے جوش و جذبے کو بلند سے بلند تر کیا۔ رولٹ ایکٹ ایجی ٹیشن اور جلیانوالہ باغ امرتسر کے سانحے کے سلسلے میں قومی پالیسی کا حامل رہا۔ سنسر شپ کی پابندیاں لگیں، طرح طرح کے عتاب نازل ہوئے مگر "سیاست" کے اُصولوں میں لرزش نہیں آئی۔ مغل پورہ ایجی ٹیشن اور تحریکِ کشمیر میں سرفروشانہ کردار ادا کیا۔

تحریکِ خلافت میں حصّہ

سیّد حبیب، تحریکِ خلافت کے زبردست حامی اور علی برادران کے مخلص ساتھی تھے۔ آپ نے تحریر و تقریر کے ذریعے تحریکِ خلافت میں مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ آپ کے اخبار "سیاست" نے تحریکِ خلافت کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ آبِ زر سے

لکھنے کے قابل ہیں۔ ١٩٢١ء میں آپ کو تحریکِ خلافت میں تن من دھن کی بازی لگانے کی پاداش میں تین سال کی قید ہوئی جو آپ نے نہایت پامردی کے ساتھ میانوالی جیل میں کاٹی۔ اس تحریک میں پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری (١٨٤١ء۔١٩٥١ء) کی زیرِ قیادت پنجاب میں اِک آگ سی لگادی۔ چونکہ آواز میں گونج اور گرج تھی لہٰذا مجمع پر چھا جاتے اور سامعین مسحور ہوجاتے۔ آپ کی سرفروشانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے قوم نے آپ کو ''فدائے ملّت'' کا لقب دیا۔

۲۴؍ مئی ١٩٢٤ء کو مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں قائدِاعظم محمد علی جناح (١٨٧٦ء۔ ١٩٤٨ء)، مولانا محمد علی جوہر (١٨٧٨ء۔١٩٣١ء)، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی (١٨٨٨ء۔١٩٣٩ء) کے علاوہ سیّد حبیب نے بھی شرکت کی۔

١٩٢٥ء میں ''تحریک خدّام الحرمین'' میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ابنِ سعود نے حجاز پر حملہ کیا تو خاندانِ شریفی بے دخل ہوکر آوارۂ روزگار ہوگیا۔ ابنِ سعود (١٨٨١ء۔ ١٩٥٣ء) نے مزاراتِ مقدسہ کے قبے خلافِ شریعت قرار دے کر گرادیے تو انجمن خدام الحرمین اور انجمن حزب الاحناف لاہور نے اس ناپاک جسارت کے خلاف تحریک چلائی۔ اس تحریک کے روحِ رواں حضرت امیرِ ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ (١٨٤١ء۔١٩٥١ء) تھے۔ سیّد حبیب نے بھرپور ساتھ دے کر تحریک کو تقویت بخشی۔ سیّد صاحب کی خدمات کی بنا پر مقدمہ چلا اور ١٩٢٧ء میں اُنھیں دو سال کے لیے پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔

اس سزا کے بارے میں۔۔۔ ماہنامہ ''یادگارِ رضا'' بریلی جلد ۲ شمارہ نمبر ۵ بابت یکم رجب المرجب ۱۳۴۶ھ (١٩٢٧ء) نے صفحہ ۳۳ پر ''سیّد برادران اور سیاست'' کے زیرِ عنوان یہ اداریہ لکھا:

''فدائے ملتِ سیّد حبیب شاہ اور ان کے برادرِ (اصغر) سیّد عنایت شاہ صاحب کی ذات اپنی دینی و ملی قربانیوں کے باعث محتاج تعارف نہیں۔ عالمِ اسلام کو ان ہر دو حضرات کی دینی خدمات کا نہ صرف اعتراف ہی ہے بلکہ اُن کی مذہبی مخلصانہ سرفروشیوں کی بنا پر ان کی محبت نے دنیائے اسلام کے قلوب کی عمیق ترین پنہائیوں میں اپنا گھر کرلیا ہے۔ اس خبر نے کہ ''ان ہر دو حضرات کو لاہور کی کچہری سے ''جمعیت خدام الحرمین'' والے مقدمہ میں دو سال کی سخت سزائے قید دی گئی۔'' اہلِ اسلام کے قلوب کو بے چین بنا دیا۔ عالمِ اسلام کو اس سے کافی صدمہ پہنچا۔ آج سیّد برادران اور اخبار ''سیاست'' پر جن مصائب کا ہجوم ہے، اگر اس پر مسلمان خون کے آنسو روئیں جب بھی کم ہے۔ ''سیاست'' کے لیے اس سے زیادہ کوئی نازک اور پُرخطر وقت نہیں آسکتا۔ میں مسلمانانِ عالم کی خدمت میں نہایت پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ اگر ان کو ''سیّد برادران'' کی مخلصانہ سرفروشیوں کا اعتراف ہے اور ان سے قلبی تعلق ہے تو اس نازک ترین وقت میں ''سیاست'' کی اعانت کو ہر امکانی صورت سے اپنا فرض سمجھیں۔ ''سیاست'' کی توسیع و اشاعت میں کافی کوشش کریں۔ خود خریدیں، اپنے اعزا و احباب و متعلقین کے نام اس کو جاری کرائیں۔ اور ہر نماز کے بعد جناب باری عزاسمہ میں بصد خشوع و خضوع سیّد برادران کی رہائی کے لیے دعا کریں۔'' (مدیر ابو المعانی محمد ابرار حسن صدیقی تلہری)۔

۱۷؍ اکتوبر ١٩٢٩ء کو بریڈ لاء ہال لاہور میں ''جمعیت خدام الحرمین'' کا جو خصوصی اجلاس منعقد ہوا، اس کی کامیابی و کامرانی کے لیے سیّد حبیب نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں۔ اجلاس بہت کامیاب و نتیجہ خیز ثابت ہوا سب نے سیّد صاحب کی خدمات کی تعریف کی۔

١٩٢٩ء میں ''غازی علم الدین شہید کیس'' میں دیوانہ وار خدمات انجام دیں۔ غازی صاحب کی نعش کی حصولی کے سلسلے میں مسلمانانِ لاہور سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''کل عصر کے وقت لاہور میں میانوالی سے کئی تار موصول ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ آج صبح صادق کے وقت غازی علم الدین کو شہید کردیا جائے گا۔ یہ خبر بجلی کے ذریعے آئی اور بجلی ہی کی تیزی سے تمام شہر میں پھیل گئی۔ صدہا مسلمان رات کے دس بجے دفتر ''سیاست'' میں آئے، اس لیے کہ اس خبر کے ساتھ یہ اطلاع بھی درج تھی کہ حکومت نے شہید کی لاش کو لاہور لانے کی اجازت نہیں دی۔ میاں علم الدین نے جو کام کیا ہے وہ بے نظیر ہے، آپ نے صفحۂ دہر پر انمٹ الفاظ میں اپنے خون سے یہ حقیقت منقش کردی ہے کہ

مسلمان لاکھ بُرے ہوں، مگر نام محمد ﷺ پر
وہ تیار ہیں ہر حالت میں اپنا سر کٹانے کو

میاں صاحب، شہید ہیں اور ہم اُن کا لاشہ حکومت سے طلب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ بت پرست، ہر خدا پرست، ہر عیسائی اور موسائی، غرض ہر مذہب کے لوگ مرنے والے کی وصیت کو پورا کرنا فرض سمجھتے ہیں اور شہید مرحوم نے وصیت کی ہے کہ اُن کو لاہور میں دفن کیا جائے۔ اس فرض کو پورا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ شہید مرحوم اب اپنے والدیا رشتہ داروں کا مال نہیں رہے۔ وہ خدا اور اُس کے رسول پاک ﷺ کا مال ہیں۔ وہ ہم مسلمانوں کا ورثہ ہیں، ان کی عزت ہماری عزت ہے اور خدا اور سول ﷺ کی عزت ہے۔

نیز مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کے مرنے والے بھی اُن کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اُن کا فیض مرنے سے ختم نہیں ہوتا اور شہید تو زندہ و جاوید ہیں۔ ہر شہید گناہ سے پاک ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ، مرحوم اور زندہ دونوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ مرحوم نیک ہو تو نماز ادا کرنے والے بخشے جاتے ہیں اور اگر نمازیوں میں ایک بھی مردِ مقدس ہو تو مرنے والے اور نمازیوں کے سب گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔"

سیّد صاحب نے جھکنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ جس بات پر ڈٹ جاتے ڈٹے رہتے۔ "ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب" سے ایک وفد کے ہمراہ ملنے کے لیے گئے تو روزوں کے دن تھے۔ افطار کا وقت ہو گیا پانی مانگا تو گورنر نے نلکے کی طرف اشارہ کر دیا۔ سیّد صاحب نے گورنر کو وہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ اگلے روز "سیاست" میں مقالہ لکھا کہ ایمرسن نے اس بدتمیزی کا مظاہرہ کرکے انگریز قوم کے اخلاق کو مجروح کیا ہے۔ محکمہ اطلاعات نے گورنر کی طرف سے تردید کی تو آپ نے اداریہ لکھا، "گورنر کا جھوٹ۔"

دوبارہ تردید آئی تو لکھا، "گورنر نے پھر جھوٹ بولا۔" حق تو یہ ہے کہ تن گئے۔

لالہ ہرکشن لال گابا (۱۸۸۶ء۔ ۱۹۲۷ء) پنجاب میں تجارت کے بادشاہ تھے دیوالیہ ہو گئے۔ عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جج سرڈگلس ینگ (س۔م۔ن) نے اُنہیں تباہ کیا ہے۔ سیّد حبیب نے ینگ پر نکتہ چینی کی۔ توہینِ عدالت کا مقدمہ چلا۔ آپ کے چھوٹے بھائی سیّد عنایت شاہ (المتوفّٰی۔ ۱۹۴۵ء) "سیاست" کے پرنٹر، پبلیشر تھے، اُنہیں طلب کیا گیا۔ جس بنچ نے سماعت کی وہ دیوان رام لعل اور سرڈگلس ینگ پر مشتمل تھا۔ شاہ صاحب کی طرف سے کوئی وکیل نہ تھا۔ ینگ نے دیوان رام لعل کی وساطت سے پوچھا، "آپ کے ساتھ کوئی وکیل ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا آپ نے کوئی وکیل نہیں کیا؟"

"اس مقدمہ میں کوئی وکیل پیش ہونے کو تیار نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ اس عدالت سے خوف زدہ ہیں۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ آپ فیس نہیں دینا چاہتے ہوں گے۔"

"ایسی بات نہیں جناب، میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحیح ہے۔"

"آپ نام بتا سکتے ہیں؟"

"جی نہیں، میں کسی کے خلاف شکایت نہیں کرنا چاہتا۔"

"آپ انگریزی میں بات کریں۔"

"مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

"آپ نے کچھ لکھا، معافی مانگنے کے لیے تیار ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا، صحیح لکھا ہے۔"

ینگ غصّے سے کانپنے لگا

"اگلی تاریخ پر وکیل ساتھ لے کر آؤ۔"

"میں کوشش کروں گا لیکن میں نے جو لکھا ہے اس عدالت کے خلاف لکھا ہے، لہٰذا یہ عدالت مستغیث ہو سکتی ہے منصف نہیں؟"

آئندہ پیشی پر ینگ نے گیارہ سو روپیہ جرمانہ اور ایک ماہ قید محض کی سزا دے دی۔ اس زمانے میں گیارہ سو روپیہ بہت بڑی رقم تھی۔ جلالپور جٹاں میں شاہ صاحب کا ذاتی مکان تھا، فروخت کرکے جرمانہ ادا کر دیا۔

ایک دفعہ سیّد حبیب نے ینگ کو ایک خط لکھا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس نے پرسنل اسٹنٹ سے لکھوا دیا کہ "وقت نہیں

ہے۔" سیّد صاحب کو غصّہ آ گیا۔ اپنے چپراسی کی معرفت تحریر کیا کہ "سیّد صاحب بھی آپ سے مل کر راضی نہیں ہیں۔ آپ کے خلاف کچھ الزامات تھے جن کی وضاحت کے لیے وہ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔" لُطف یہ کہ اس تحریر پر چپراسی کے دستخط بھی نہیں تھے۔

مسلم لیگ کی حمایت

۲۹ / دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کی زیرِ صدارت شہر الٰہ آباد کے محلہ یاقوت گنج کے تمباکو فروش شیخ رحیم بخش کے مکان میں ہوا تو مولانا عبدالماجد بدایونی (۱۸۸۷ء۔۱۹۳۱ء)، سیّد حسین امام وارثی (۱۸۹۷ء۔۱۹۸۵ء) جیسے قائدین کے ساتھ سیّد حبیب نے بھی شرکت کی۔

۲۴ / ستمبر ۱۹۳۴ء کو مسلم یونیٹی بورڈ نے اپنے اجلاس میں جمعیت علماءِ ہند (دہلی) کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ بورڈ شریعت کے معاملات میں جمعیت کا مشورہ قبول کرے گا۔ تو اس پر جمعیت علما (کانپور) کے سیکریٹری مولانا مظہر الدین شیر کوٹی (۱۸۸۸ء۔۱۹۳۹ء) نے اس کی تردید کر دی اور ساتھ ہی اپنی جمعیت کا اجلاس طلب کر لیا جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۸۹۸ء۔۱۹۷۰ء)، شاہ محمد سلیمان پھلواروی (۱۸۵۹ء۔۱۹۳۵ء)، علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی (۱۸۸۸ء۔۱۹۴۱ء)، مولانا محمد شفیع داؤدی (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۹ء) وغیرہم کے علاوہ سیّد حبیب نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں مسلم یونیٹی بورڈ کی حمایت کا فیصلہ ہوا اور جمعیت علماءِ ہند سے لاتعلقی کا اعلان کیا گیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۳۵ء کو برکت علی اسلامیہ ہال بیرون موچی گیٹ لاہور میں شیخ صادق حسن امر تسری (۱۸۸۷ء۔۱۹۵۹ء) کی زیرِ صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں میاں عبدالحی ایم اے ایل شیخ محمد حسین سیکریٹری مسلم بینک آف انڈیا لمیٹڈ، مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۲ء۔۱۹۵۶ء) کے علاوہ سیّد حبیب نے بھی شرکت کی۔

اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ اس امر پر غور کیا جائے کہ کس طرح صوبے کے مسلمانوں کو تجارتی لحاظ سے منظم کیا جا سکتا ہے۔ قرار پایا کہ مسلمان صرف اسی صورت میں ہمسایہ اقوام جیسی ترقی کر سکتے ہیں کہ وہ تجارت کو اختیار کریں اور تجارتی لحاظ سے اپنی شیرازہ بندی کریں۔ ایک "مرکزی ایوانِ تجارت" قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی شاخیں صوبہ بھر میں قائم کی جائیں۔

۱۹۳۵ء کے زلزلے سے قبل سیّد حبیب نے نواب خاران (بلوچستان) کی دعوت پر ریاست خاران کی سیاحت کی اور ایک تذکرہ "تذکرۂ خاران" کے نام سے مرتب کیا۔ جو بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ ۱۹۳۵ء ہی میں حضرت امیر ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کی زیرِ قیادت "تحریک مسجد شہید گنج" میں بھرپور حصّہ لیا۔

۳۷۔ ۱۹۳۶ء میں جب مسلم لیگ کو دوبارہ ایک فعال اور عوامی جماعت کا روپ دیا گیا، حضرت قائداعظم کی قیادت میں سیّد حبیب نے بھی مسلم لیگ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آپ کے اخبار روزنامہ "سیاست" نے مسلمانوں میں بیداری اور حریت کا جذبہ پیدا کرنے کے مقدس مشن میں برابر مصروفیت اور سرگرمی دکھائی۔ مسلم لیگ کی حمایت میں اپنے ہندو معاصرین "دیش"، "کسیری"، "پرتاب"، "بندے ماترم" اور "ملاپ" کے خطرناک حملوں کا مشترکہ طور پر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی ان ہی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں اتحاد، فکر اور قومی یکجہتی کا جذبہ بیدار ہوا۔

تحریکِ پاکستان میں کردار

سیّد حبیب نے قیامِ پاکستان کی کوششوں میں اپنے آپ کو انتہائی مصروف کر لیا حتیٰ کہ ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک حقیقت بن کر اُبھرا۔

۱۹۳۷ء میں سیّد حبیب نے سر سکندر حیات خاں وزیرِ اعظم پنجاب (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۴۲ء) کی مسلم لیگ دشمن پالیسیوں پر کڑی تنقید کی۔ سر سکندر آپ کی حق گوئی و بیباکی کی تاب نہ لا سکا اور حکومت نے آپ کے اخبار "سیاست" سے سات ہزار روپیہ ضمانت طلب کی جو ادا نہ کی جا سکی اور "سیاست" ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس کے بعد روزنامہ "منشور" جاری کیا اور ۱۹۴۹ء میں روزنامہ "غازی" نکالا۔

میانہ قد اور کھلتے ہوئے گندمی رنگ والے سیّد حبیب نے تمام زندگی حق و صداقت کا پھریرا لہرایا۔ کئی بار قید و بند کی صعوبتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ ہر ظالم و جابر سے ٹکرانے میں ذرّہ بھر بھی تامل نہ کیا۔ تمام زندگی لوگوں کی سفارشیں کرنے، محتاجوں کی امداد کا جتن کرنے اور مظلوموں کی دادرسی کے لیے افسروں سے جھگڑنے والے

اس بے لوث مردِ مجاہد کی آخری عمر نہایت افلاس، غربت اور بے کسی میں گزری۔

وفات

۲۳/ فروری ۱۹۵۱ء مطابق ۱۶/ جمادی الاوّل ۱۳۷۰ء بروز جمعۃ المبارک آپ کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور لاہور کے مشہور و معروف قبرستان میانی صاحب میں تدفین ہوئی۔(۷)

مولانا حسرت موہانی علیہ الرحمہ

آپ کا اسم گرامی مولانا سیّد فضل الحسن اور حسرتؔ تخلص تھا؛ ۱۸۷۳ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ (یوپی، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ (۸) والدہ ماجدہ کا اسم گرامی شہر بانو بیگم بنتِ نیاز حسن تھا۔ دنیائے علم و ادب، شریعت و طریقت اور صحافت و سیاست میں مولانا حسرتؔ موہانی کے نام سے شہرت پائی اور بقائے دوام حاصل کی۔ خاندان کے بزرگِ اعلیٰ سیّد محمود، نیشاپور سے ہندوستان آئے اور موہان کو جائے سکونت بنایا شجرۂ نسب حضرت امام علی موسیٰ کاظم رضا رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے جن کا مزارِ مقدس نیشاپور (ایران) میں مرجع خلائق ہے۔(۹)

تعلیمی دور

مولانا حسرتؔ موہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۸۹۴ء میں موہان سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پورے صوبے میں اوّل آئے۔ ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ مڈل اسکول فتح پور ہسودہ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے عربی اور ریاضی کے ساتھ بی اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور ساتھ ہی ساتھ دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ شاعری میں سیّد فخر الحسن فطرتؔ موہانی (س۔م۔ن) اور منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی (۱۸۲۰ء۔ ۱۹۱۱ء) سے تلمذ تھا۔ مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ حضرت شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی (۱۸۲۲ء۔ ۱۸۸۹ء) سے بیعت تھے، ان کی رحلت کے بعد حضرت شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۰۳ء) سے تجدید بیعت کی اور قیام الدین والملت حضرت مولانا محمد عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۲۶ء) سے اجازت و خلافت پائی۔ پہلا حج ۱۹۳۲ء میں اور آخری حج ۱۹۵۰ء میں کیا۔(۱۰)

تحریکِ پاکستان میں حصّہ

۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے ماہنامہ "اُردوِ معلّی" نکالا۔ ۱۹۱۴ء میں سہ ماہی "تذکرۃ الشعرا" جاری کیا اور ۱۹۲۸ء میں کانپور سے روزنامہ "مستقبل"، علی گڑھ، کا اجرا کیا جو بعد میں دو روزہ، سہ روزہ، ہفت روزہ اور ماہنامہ ہو کر بالآخر "اُردوِ معلّی" میں ضم ہو گیا۔ ۱۹۰۳ء میں سیاسی مضامین کا آغاز کیا۔ ۱۹۰۴ء سے عملی سیاست میں حصّہ لیا۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۲۰ء میں سالانہ اجلاس مسلم لیگ میں شرکت کی۔ ۲۰/ دسمبر ۱۹۲۱ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا چودھواں سالانہ اجلاس احمد آباد میں ہوا تو صدارت کے لیے نظرِ انتخاب مولانا حسرتؔ موہانی رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد پر نظرِ ثانی کی جائے، مسلم لیگ کے دروازے عام لوگوں پر کھول دیے جائیں۔ مولانا نے اپنے اس تاریخی خطبے میں کامل آزادی کا ذکر کیا۔ انگریز حکومت نے یہ خطبۂ صدارت ضبط کر لیا اور گرفتار کر کے مقدمۂ بغاوت قائم کر دیا۔(۱۱)

۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیم جدید سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم لیگ یوپی پارلیمانی بورڈ کے ممبر اور یوپی مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے مستقل ممبر بن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ کو نوابوں اور امیروں کی جماعت سمجھا جاتا تھا، مولانا کا وجود اس اعتراض کا مسکت جواب تھا۔ آپ نے مسلم لیگ کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے سب سے زیادہ کام کیا۔ قائد اعظم کا تعارف کراتے ہوئے اسٹیج سے بارہا یوں کہا جاتا تھا کہ یہ مولانا حسرتؔ موہانی کے تسلیم شدہ قائد ہیں اور اس بات کا سامعین پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا تھا۔(۱۲)

قائد اعظم کی قیادت میں جب مسلم لیگ ایک ہمہ گیر سیاسی جماعت بن گئی تو مولانا حسرتؔ موہانی نے ۱۹۳۷ء میں سالانہ اجلاس لکھنؤ کے موقعہ پر "مکمل آزادی" کی قرار داد پیش کی۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کا مقصد ہندوستان میں مکمل آزادی کا قیام ہو گا جو آزاد جمہوری ریاستوں کی وفاقیہ پر منحصر ہو گا۔ اس کے دستور کے تحت مسلمانوں اور دیگر تمام اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا جائزہ اور مؤثر تحفظ فراہم کیا جائے گا۔"

اس قرار داد کا پُر شور، پُر جوش طویل تالیوں سے خیر مقدم

کیا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۲ءِ ۔ ۱۹۵۶ء)، چوہدری خلیق الزماں (۱۸۸۹ء ۔ ۱۹۷۳ء)، سیّد حسین امام (۱۸۹۷ء ۔ ۱۹۸۵ء)، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۳۹ء)، عبدالرحمٰن صدیقی (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۵۳ء)، بیگم مولانا محمد علی جوہر (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۴۷ء) اور دیگر بہت سے لوگوں نے مولانا کی قرار داد کی تائید میں تقریریں کیں۔ ''اسلام زندہ باد'' اور ''اللہ اکبر'' کے نعروں کی گونج میں قرار داد منظور ہوئی۔

اس اجلاس میں مولانا حسرتؔ موہانی کی کوششوں سے مسلم لیگ کا نصب العین ''کامل آزادی'' اور ایسا وفاقی طرزِ حکومت معین ہوا جس کے صوبے اندرونی طور پر آزاد ہوں۔ جدید نصب العین کی تحریک کرتے ہوئے مولانا نے صاف طور پر اعلان کردیا کہ وفاق ہند کے صوبوں کو اس لیے وہ آزاد رکھنا چاہتے ہیں کہ مرکزی حکومت مسلمانوں کی اکثریت کے اُصولوں کے ساتھ انصاف نہ کرے تو یہ صوبے وفاق ہند سے باہر نکل آئیں اور اگر ہندو اکثریتی صوبے نو آبادیاتی طرزِ حکومت پر قناعت کرلیں تو اسلامی اکثریت کے صوبے آزاد حکومت بنالیں اور ضرورت ہو تو ''جمہوریہ شوریہ رومیہ'' سے مل جائیں۔ اس اجلاس کے بعد مولانا مسلم لیگ کے ہر سالانہ اجلاس اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی ہر نشست میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔

۱۹۳۷ء میں بلند شہر اور امروہہ کے الیکشن میں مولانا حسرتؔ موہانی نے مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۸۹۸ء ۔ ۱۹۷۰ء)، مولانا شوکت علی (۱۸۷۲ء ۔ ۱۹۳۸ء)، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی (۱۸۸۸ء ۔ ۱۹۴۱ء) اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی (۱۹۱۹ء ۔ زندہ) کے ساتھ مل کر دن رات ایک کرکے حلقے کا دورہ کیا اور مسلم لیگ کی دھاک بٹھادی۔ مولانا حسین احمد مدنی دیوبندی (۱۸۷۹ء ۔ ۱۹۵۷ء) وغیرہ نے مسلم لیگ کے خلاف بڑا مذموم پروپیگنڈا کیا مگر کامیابی نے قدم مسلم لیگ کے چومے جو دو ہزار ووٹوں کی برتری سے کامیاب ہوئی۔

۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کی وسیع تنظیم کا کام شروع ہوا تو مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۸۹۸ء ۔ ۱۹۷۰ء)، مولانا کرم علی ملیح آبادی (۱۸۹۲ء ۔ ۱۹۷۲ء) مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی (۱۹۱۹ء ۔) کے ساتھ مولانا حسرتؔ موہانی نے بھی اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرکے شہر شہر اور گاؤں گاؤں مسلم لیگ کے مقاصد کو روشناس کرایا اور مسلم لیگ کے جھنڈے کو بلند رکھا۔ اسی سال سہارنپور میں صوبائی اسمبلی کے ضمنی الیکشن کا معرکہ بھی سر کیا۔

۳۰،۳۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس دہلی میں ہوا جس میں فلسطین کے سلسلے میں برطانوی مال کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے کونسل نے جو کمیٹی بنائی اس میں مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا قطب الدین، عبدالوالی فرنگی محلی اور مولانا مظہر الدین شیر کوٹی کے علاوہ مولانا حسرتؔ موہانی بھی شامل تھے۔

۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی تو برّصغیر کے کونے کونے میں ایک ہی نعرہ سُنائی دیتا تھا۔ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔'' مولانا حسرتؔ موہانی علیہ الرحمۃ نے اس نعرے کو مقبولِ عام بنانے کے لیے ہندوستان کے چپے چپے کا دورہ کرکے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ اپنی تقریروں اور تحریروں سے مسلم لیگ کی جس قدر خدمت کی اس کی مثال ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ اُن کی ادبی نگارشات ہوں یا سیاسی سرگرمیاں، اُن سب کا مقصد حصولِ آزادی ہوتا تھا۔ اسی لیے آج ہم جنگِ آزادی کے دیگر زعما کا ذکر کرتے وقت اس مردِ مجاہد کے کارناموں کو کسی صورت میں بھی فراموش نہیں کرسکتے۔ اس مردِ حریت شعار کو فرنگی نے ہزار بار جھکانے کی کوشش کی مگر حسرتؔ موہانی کو جھکانے کی اُن کی حسرت کبھی بھی پوری نہ ہوسکی، خود فرماتے ہیں ؎

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہ کرتے

تحریکِ آزادی کے سلسلے میں مولانا حسرتؔ موہانی تین بار جیل گئے۔ جُرمانے اور قید بامشقت کی سزائیں اُن کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل سے باز نہ رکھ سکیں۔ پہلی گرفتاری ۱۹۰۸ء میں ''اُردوئے معلی'' میں ایک مضمون ''مصر میں انگریزوں کی پالیسی'' شائع کرنے پر ہوئی۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے کمالِ جرأت و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مضمون نگار کا نام بنانے سے انکار کردیا۔ ۲؍جون ۱۹۰۸ء کو مقدمے کا آغاز ہوا اور ۴؍اگست ۱۹۰۸ء کو فیصلہ۔ دو سال قیدِ بامشقت اور پانچ سو روپیہ جُرمانے کی سزا ہوئی۔ ہر روز ایک من آٹا

پیسنا پڑتا تھا۔ یہ شعر اسی دور کی یادگار ہے (۱۳)

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

دوسری بار مئی ۱۹۱۶ء کو دو سال قیدِ بامشقت ہوئی۔ للت پور، جھانسی، الٰہ آباد، پرتاب گڑھ، فیض آباد، لکھنؤ اور میرٹھ کی جیلوں میں ایذائیں برداشت کرتے تھے۔ جُرم یہ تھا کہ مولانا حسرتؔ موہانی علیہ الرحمۃ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کو ایک آزاد اور خود مختار تعلیمی ادارہ دیکھنا چاہتے تھے جب کہ فرنگی حکومت اس کے قیام کی اجازت اس صورت میں دینے کو تیار تھی کہ اس پر حکومت کا کنٹرول رہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ مولانا حسرتؔ موہانی کی دوسری قید سخت، آزادیِ علم کی خاطر ہوئی اور اُنہوں نے اپنی مادر درس گاہ کی آزادی کی خاطر خود کو مصائبِ زنداں میں گرفتار کروادیا تھا۔

تیسری گرفتاری ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ کے اجلاس احمد آباد کے صدر اجلاس ہونے اور صدارتی خطبہ پڑھنے پر ہوئی۔ یہ خطبہ حکومت نے ضبط کرلیا۔ اس خطبے میں مولانا نے "آزادیِ کامل" کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ مطالبہ فرنگی کی نازک مزاجی پر گراں گزرا اور دو سال قیدِ بامشقت کے سزاوار ٹھہرے۔

یہ بات تو عام تذکروں میں لکھی گئی ہے کہ مولانا حسرتؔ موہانی کی آواز باریک تھی، لیکن اس بات کا کھوج لگانے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں کی کہ ایسا کیوں تھا۔ دراصل پہلی گرفتاری کے دوران برطانوی حکومت نے جیل میں آپ کو دھتورا کھلا دیا تھا تاکہ یہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے؛ مگر "جس کو اللہ رکھے اُس کو کون چکھے" کے مصداق حکومت اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ مولانا حسرتؔ موہانی کی آواز خراب تو ضرور ہوگئی مگر جذبۂ حریت میں کسی قسم کی کمی نہ آئی۔ جب بھی جیل سے باہر آتے، نئے جوش اور نئے عزم کے ساتھ جہاد آزادی میں شریک ہوجاتے۔ آپ کے دم سے ہی بہت سے کم ہمتوں کی ہمتیں بندھیں اور بہت سے اولوالعزم لوگوں نے آپ کی تقلید کی اور باہر کی مصنوعی آزادی کو جیل کی سختیوں پر قربان کردیا۔

مولانا حسرتؔ موہانی نے سرکاری ملازمت کی بجائے انگریز سے ٹکر لینے کو ترجیح دی، عیش کی بجائے کانٹوں کی سیج کا انتخاب کیا، حکومت کی غلط پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ان کی زندگی سادگی، درویشی اور قناعت کا مرقع تھی، مولانا حسرتؔ موہانی ایک سچے مسلمان کی طرح ظاہری نام و نمود کے قائل نہ تھے، ساری عمر حق گوئی اور بے باکی میں گزری۔ اپنے اخبار میں وہ صاعقہ پاشی کی کہ پورے برّصغیر میں آپ کے قلم کا چرچا تھا، جو لکھتے بے باک ہوکر لکھتے، صدائے حق بلند کرتے وقت کسی سے نہ ڈرتے، یہی وجہ تھی کہ اُنہیں متعدّد بار پسِ دیوارِ زنداں جانا پڑا؛ مگر اُن کی زبانِ فیض ترجمان پر یہ نعرہ رہا ؎

بڑھتا ہے ذوقِ جُرم یاں ہر سزا کے بعد

فروری ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مولانا حسرتؔ موہانی نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کانپور کے شہری حلقے سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ مولانا حسرتؔ موہانی کے مقابلے پر پانچ اُمیدوار تھے۔ کامیابی نے مولانا حسرتؔ موہانی کے قدم چُومے۔ جس نے ۱۹۳۳۳ ووٹ حاصل کیے۔

۱۰/اپریل ۱۹۴۶ء کو عربک کالج دہلی میں "مسلم لیگ لیجسلرز کنوینشن" منعقد ہوا تو اس موقع پر سیّد الاحرار مولانا حسرتؔ موہانی سے مجاہدِ ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی (۱۹۱۵ء۔۲۰۰۱ء) کی ملاقات ہوئی۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے مولانا نیازی کو بھرپور شفقت سے نوازا، دعائیں دیں اور تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے فرمایا:

"نیازی! افسوس کہ اب میری شام ہے اور تمہاری دوپہر۔ اے کاش مجھے تم پہلے ملے ہوتے تو دونوں مل کر قوم کے لیے کچھ کام کرتے۔"

پھر اپنے یہ اشعار سُنائے ؎

نہیں ہے قدر داں کوئی تو میں خود ہوں قدرداں اپنا
تکلف بر طرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں
کمالِ خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرتؔ!
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

۹/ جون ۱۹۴۶ء کو قائد اعظم نے "کیبنٹ مشن پلان" پر غور کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس امپیریل ہوٹل دہلی میں طلب کیا۔ مولانا حسرتؔ موہانی اور مولانا محمد عبد الستار خاں نیازی، دونوں نے اس اسکیم کی زبردست مخالفت کی۔ ووٹنگ پر ساڑھے چھ سو کے ہاؤس میں بمشکل سولہ سترہ آدمی اُن کے ہم نوا بن سکے مگر یہ دونوں حضرات اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ مسلم لیگ نے یہ اسکیم بھاری اکثریت سے منظور کر لی۔ بعد میں انگریز حکومت کی بد عہدی کے پیشِ نظر حضرت قائد اعظم نے ۱۶/ جولائی ۱۹۴۶ء کو یہ اسکیم مسترد کر دی اور ۲۹ کو "راست اقدام" کا فیصلہ کیا۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں "مسلم لیگ کونسل" کا ایک تاریخی اجلاس بمبئی میں ہوا۔ اس میں شرکت کے لیے مولانا جمال میاں فرنگی محلی بھی ہوائی جہاز میں مولانا حسرتؔ موہانی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں مولانا حسرتؔ موہانی نے مولانا جمال میاں سے فرمایا: "سُنیے صاحب! پاکستان تو مل جائے گا، اب آئندہ کی فکر کرنی چاہیے۔" مولانا جمال میاں نے عرض کیا کہ آپ کو کیسے یقین ہو گیا کہ پاکستان مل جائے گا؟ فرمانے لگے، میں نے نبیِ کریم ﷺ کی زیارت کی ہے اور "دیوانِ حافظؔ" سے تفاول کیا تو شعر بھی مناسب نکلا اور حافظؔ کی اس غزل پر میں نے تضمین بھی کر دی اور اسی وقت ڈائری سے درجِ ذیل اشعار سُنائے ۔

جب کہے خواب میں خود آکے شاہِ خوباں
جب کہ حافظؔ بھی مصدوق ہو یہ فالِ دیواں
تجھ کو حسرتؔ یہ مبارک سند مہر و نشاں
پردہ بردار کہ تا سجدہ کند جملہ جہاں
طاقِ ابروئے تو محرابِ جہاں خواہد شُد!

مولانا حسرتؔ موہانیؒ نے یہ خواب ۱۸/ مارچ ۱۹۴۶ء کو دیکھا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مولانا حسرتؔ موہانی ہندوستان میں ہی رہے۔ اُن کی غیرتِ ایمانی نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جائیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اُن کا وجودِ مسعود بہت بڑا سہارا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اپنی ذمّے داریوں کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر کلمۂ حق بلند کیا۔

۱۱/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حضرت قائدِ اعظم (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) کی وفات ہوئی تو مولانا حسرتؔ موہانی کو بہت غم ہوا۔ اپنے "روزنامچے" میں تحریر فرماتے ہیں:

"۱۲/ ستمبر ۱۹۴۸ء آج صبح گھر سے نکلنے پر قائدِ اعظم محمد علی جناح کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مرحوم اپنا مقصد پورا کر کے دنیا سے اُٹھے۔ ایسی کامیابی بہت کم لیڈروں کو حاصل ہوتی ہے۔"

۱۹۵۰ء میں کانپور سے فرنگی محلی لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ اسی سال ستمبر میں آخری حج کیا۔ حج سے واپسی پر اکتوبر میں کراچی تشریف لائے تو "انجمن ترقیِ اُردو" کے دفتر میں ایک عقیدت مند نے آپ سے عرض کیا، حضور! گستاخی نہ ہو تو اپنے اس شعر کے معنی بتا دیجیے، سمجھ میں نہیں آیا ہے ۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

مولانا حسرتؔ موہانی نے جواب میں فرمایا: "بہتر ہو گا کہ اس شعر کے معنٰی سُننے کے بجائے، اس کے معنٰی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور یہ کہہ کر مولانا حسرتؔ موہانی نے اپنا کُرتہ اُٹھا کر اپنی پیٹھ سامنے کر دی، جس پر زخموں کے تین بہت بڑے نشان تھے جو برطانوی حکومت کے اہلکاروں کی جانب سے قیدِ فرنگ میں ہنٹروں سے پٹائی کی صورت میں مولانا حسرتؔ موہانی کو حاصل ہوئے تھے۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے فرمایا: "ان کے آگے تو چکی کی مشقت کچھ بھی نہیں تھی۔" اس پر حاضرین کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے کہ وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

مشہور جرنلسٹ، سابق سینٹر اور مولانا حسرتؔ موہانی میموریل سوسائٹی کراچی کے صدر سیّد اشتیاق اظہر (ب ۱۹۲۵ء) بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ مولانا حسرتؔ موہانی کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ مولانا حسرتؔ موہانی کے دونوں پاؤں اور ٹخنے بالکل سیاہ تھے۔ نماز کے بعد جب مولانا حسرتؔ موہانی سے اس کے متعلق

دریافت کیا گیا تو آپ نے اپنے دونوں پائنچے اُٹھا کر اپنی ٹانگیں دکھائیں جو بالکل سیاہ تھیں اور بتایا کہ فرنگی کی جیل میں اُنہیں گھنٹوں اُلٹا لٹکایا جاتا تھا جس کے نتیجے میں دونوں ٹانگیں بالکل سیاہ ہو کر رہ گئیں؛ مگر فرنگی حکومت مولانا حسرتؔ موہانی کے چہرے پر دینِ مبین کی محبت، زہد و تقویٰ، صداقت، شرافت، آزادی، کسرِ نفسی اور عشقِ رسول ﷺ کے نور کو نہ مٹا سکی اور نہ مخالفوں کی ریشہ دوانیاں اس کے سامنے اپنے چراغ جلا سکیں۔

کراچی سے ہندوستان واپسی پر مولانا حسرتؔ موہانی قیامِ پاکستان کے بعد پہلی اور آخری دفعہ لاہور تشریف لائے۔ اُنہیں پاکستان اور اہلِ پاکستان کے معاملات سے بڑی حد تک دل چسپی رہی۔ ایک اخباری بیان میں اُنہوں نے پاکستان کی تشکیل، کامیابی اور ترقی کے لیے اپنے نیک جذبات کا اظہار کیا:

گونا گوں مصروفیات کے باوجود مولانا حسرتؔ موہانی نے مندرجہ ذیل کتابیں بھی لکھیں:

- کلیاتِ حسرتؔ موہانی
- دیوان غالب بمع شرح
- مشاہداتِ زنداں
- نکاتِ سخن
- اربابِ سخن کانپور
- انتخابِ سخن

وفات

۱۳ مئی ۱۹۵۱ء / ۱۳۷۰ھ کو استغفار اور درود شریف پڑھتے ہوئے مولانا حسرتؔ موہانی نے رحلت فرمائی۔ باغِ انوار میں نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور اپنے مرشد شاہ عبدالوہاب علیہما الرحمۃ کے قدموں میں دفن ہوئے۔

حوالہ جات

(۱) آپ مولانا احمد رضا خاں بریلوی خلفا میں سے تھے۔

(۲) ہفت روزہ ''الفقیہ''، مارچ ۱۹۲۴ء امرتسر، ص:۹۔

(۳) بتصرف ''تحریکِ پاکستان اور علماءِ کرام'' ص:۱۵۱ سے ۱۵۵، مولانا محمد صادق قصوری، تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل کتب دیکھیے:

۱۔ ذاتی یادداشتیں۔ حکیم موسیٰ امرتسری

۲۔ ہفت روزہ ''الفقیہ''، امرتسر لاہور، ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۹ء۔

(۴) شاہراہِ پاکستان، چوہدری خلیق الزماں، ۱۹۶۷ء کراچی ص:۸۷۔

(۵) تحریکِ پاکستان اور علماءِ کرام (بتصرف) صادق قصوری، ص ۱۶۸ تا ۱۷۸، تفصیلات کے لیے دیکھیے۔

- ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصّہ، ڈاکٹر عابدہ
- پاکستان ناگزیر تھا، سیّد حسن ریاض
- تحریکِ پاکستان، منصور احمد بٹ
- تحریکِ خلافت، محمد عدیل عباسی

(۶) ''تحریکِ پاکستان اور علماءِ کرام'' مؤلف صادق قصوری، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۸۱۔

مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے:

- جدّوجہدِ آزادی میں پنجاب کا کردار
- غازی علم الدین شہید
- روزنامہ سیاست لاہور اگست ۱۹۲۸ء

(۷) اکابر تحریکِ پاکستان، محمد صادق قصوری / ۱۹۷۹ء، نوری بک ڈپو لاہور، ص:۷۹۔

(۸) تحریکِ پاکستان اور علماءِ کرام، محمد صادق قصوری، ۱۹۹۹ء، مکتبہ زاویہ، لاہور، ص:۱۹۱۔

(۹) ایضاً ص:۱۹۲۔

(۱۰) حسرتؔ موہانی کی سیاسی زندگی عبدالقوی، مطبوعہ بمبئی، ۱۹۵۶ء، ص:۱۱۔

(۱۱) تحریکِ پاکستان اور علماء کرام، صادق قصوری، لاہور، ص:۱۹۲۔

(۱۲) ہفتہ روزہ چٹان ۵، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۴ء، ص:۶۔

(۱۳) مطالعہ کے لیے دیکھیے:

- مولانا حسرت موہانی، پروفیسر شفقت رضوی، کراچی۔
- کاروانِ گم گشتہ، رئیس احمد جعفری، کراچی۔
- مشاہیر جنگ آزادی، انتظام اللہ شہابی۔

ooooo

کلامِ رضا بریلوی میں علمی مصطلحات کی ضیاباریاں

ڈاکٹر محمد حسین مُشاہد رضوی (مہاراشٹر، انڈیا)

امام احمد رضا محدثِ بریلوی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر کچھ خامہ فرسائی کرنا مجھ جیسے کم علم اور بے بضاعت کا کام ہر گز نہیں، ہاں! آپ کے عقیدت مندوں کی صف میں شامل ہونا باعثِ صد افتخار سمجھتے ہوئے یہ چند سطریں سپردِ قرطاس کرنے کی طالب علمانہ کوشش کررہا ہوں۔ امام احمد رضا محدث بریلوی کی نعت گوئی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے کئی محققین نے پی۔ایچ۔ڈی۔ اور ایم۔فل، جیسی باوقار ڈگریاں بھی حاصل کی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے نعت گوئی کے میدان میں جو اجلے اور روشن نقوش ثبت فرمائے ہیں آج فضائے نعت میں اپنے شہبازِ فکر و نظر کو پرواز کرانے والے بیش تر شعرائے کرام محسوس یا غیر محسوس طور پر آپ کی کہیں نہ کہیں تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امام احمد رضا کی فکر رسانے نعت گوئی میں ایسے خوب صورت اور دل کش گل بوٹے کھلائے ہیں کہ جس کی مثیل و نظیر کسی دوسرے نعت گو کے یہاں نہیں ملتی۔ مفخرِ موجودات ﷺ کی عقیدت و محبت اور تعظیم و توقیر کے اعتبار سے تو آپ کے کلام کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہے اس کا کوئی جواب نہیں پیش کیا جاسکتا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ عشقِ رسالت پناہی ﷺ میں آپ کا اسم شریف اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تو یہ مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ نعت گوئی میں عقیدے و عقیدت کی نور افزا پرچھائیوں کے ساتھ آپ کے کلام میں جہاں فکر و فن، جذبہ و تخیل اور متنوع شعری وفنی رچاؤ کے دل نشیں تصورات ابھرتے ہیں، وہیں آپ کے نعتیہ نغمات میں اکثر اشعار مصطلحاتِ علمیہ اور تلمیحاتِ دینیہ سے ایسے مالامال ہیں کہ ان کو سمجھنے کے لیے عالمانہ فہم و فراست کی ضرورت ہے۔ آج جب کہ تعلیمی معیار بالکل گراوٹ کا شکار ہو چکا ہے اور ہمارے تعلیمی اداروں میں سطحی تعلیم دی جارہی ہے ایسے عالم میں امام احمد رضا بریلوی کے علمی و فنی خوبیوں سے آراستہ و مزین اشعار ہم جیسے کم علموں کی سمجھ سے ورا ہوتے جارہے ہیں، مثلاً یہ شعر دیکھیں۔

مہر میزاں میں چھپا ہو تو حمل میں چمکے
ڈالے اک بوند شبِ دے میں جو بارانِ عرب

اس کی ممکنہ تشریح و توضیح کے لیے ضروری ہے کہ ہم علمِ ہیئت سے واقف ہوں اور علمِ نجوم پر بھی گہری نظر ہو اور بروج و میزان اور حمل وغیرہ کے خواص سے آگاہی اور علمِ موسمیات کا بھی درک ہو تب ہی ہم اس شعر سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ اس شعر میں مہر (سورج) میزان (آسمان کے بارہ برجوں میں سے ساتواں برج)، حمل (دنبے کی شکل کا ایک آسمانی برج)، شبِ دے (اکتوبر کے مہینے کی رات)۔۔۔ جیسی اصطلاحات کا استعمال کرکے امام احمد رضا کہتے ہیں کہ عربِ مقدس کی بارش اکتوبر کے مہینے کی رات میں اگر ایک قطرہ ہی گرادے تو سورج اگر برجِ میزان میں چھپا ہو تو وہ وہاں سے نکل کر برجِ حمل میں آکر چمکنا شروع ہو جائے گا اور خشک سالی کا نام و نشان مٹ جائے گا جو کہ عرب کے چاند سیّدِ عالم ﷺ کی نسبتِ پاک کی برکت کا ظہور ہی ہے، علاوہ ازیں یہ شعر خاطر نشین کریں۔

بارھویں کے چاند کا مجرا ہے سجدہ نور کا
بارہ برجوں سے جھکا اک اک ستارا نور کا

اس شعر کو بھی سمجھنے کے لیے علمِ نجوم کی اصطلاحات سے واقفیت حد درجہ ضروری ہے۔ اس شعر میں امام احمد رضا کا خامۂ گل رنگ رسولِ کائنات ﷺ کی تعریف و توصیف کے لیے علمِ نجوم کا استعمال کرتے ہوئے بارہ برجوں کا ذکر کرکے کہتا ہے کہ جب بھی چاند کی بارہ تاریخ آتی ہے تو آسمان کا چاند بارھویں کے چاند یعنی رحمتِ عالم ﷺ کی ولادتِ باسعادت (۱۲/ ربیع الاول) کی خوشی اور نسبت سے جھک جھک کر بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں آداب و سلامی بجا لاتا ہے اور نہ صرف چاند بل کہ دائرۂ فلک کے بارہ برجوں: اسد، ثور، جدی، جوزہ، حمل، حوت، دلو، سرطان، سنبلہ، شرف، عقرب، میزان کا ہر ہر ستارا بھی جھک جھک کر حضورِ انور ﷺ کی بارگاہ میں

سلام عرض کرتا ہے اور بہ زبانِ حفیظؔ جالندھری یوں کہتا ہے کہ ؎

ترے آنے سے رونق آگئی گل زارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہوگیا پھر فضلِ ربانی
ترا در ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو، ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

ہوسکتا ہے بعض حضرات یہاں معترض ہوا ٹھیں کہ نعت جیسی صنف میں ان علمی اصطلاحات کا لانا کیا معنیٰ؟ تو اس ضمن میں عرض ہے کہ امام احمد رضا کے دور کا یہ مزاج تھا کہ شعرا اپنے اشعار میں جذبات وخیالات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے تجربے اور علمی اصطلاحات کو جگہ دیتے تھے اور اس عہد میں ایسے اشعار کو بہ آسانی سمجھنے والے لوگ بھی تھے جو کہ فی زمانہ مفقود ہیں۔ آج سوداؔ، ذوقؔ اور مومنؔ کے قصائد، عزیزؔ لکھنوی کے مناقب، حضرت محسنؔ کاکوروی کے نعتیہ قصیدے اور ان کی تشابیب، اور دبیرؔ کے مراثی اور ان میں پائی جانے والی تلمیحات اور مذہبی روایات آج ہمارے لیے معمّا اور چیستاں بن کر رہ گئی ہیں، جاننا چاہیے کہ اس کا سبب محض ہمارا سطحی نظامِ تعلیم ہے۔ اس لیے ایسے افکارِ عالیہ اور اصطلاحاتِ علمیہ سے سجے سنورے اشعار کو فہم نہ کرپانے کی بنیاد پر ایسا اعتراض کرنا کہ ان کو اشعار میں نظم کرنے کی کیا ضرورت تھی ادبِ عالیہ کے گراں قدر جوہر پاروں سے صرفِ نظر اور اپنی علمی بے مائیگی پر پردہ ڈالنے کی سعیِ نامشکور ہے۔

دراصل امام احمد رضا بریلوی نے اپنے کلام کے حوالے سے دنیا بھر کے علوم و فنون کا فن کارانہ اور عالمانہ استعمال کرتے ہوئے نعتِ رسول ﷺ اس لیے قلم بند فرمائی ہے کہ آپ نے اپنی نعت گوئی سے علوم و فنون کو بھی نعتِ سرکار ﷺ میں مصروف کردیا ہے۔ مضمون آفرینی اور خیال آفرینی کا جو نت نئے اور جدت و ندرت سے مملو اظہار یہ آپ کے کلام میں ملتا ہے وہ باوجود تلاش و تفحص دیگر شعرا کے یہاں کم نظر آتا ہے یہ امر امام احمد رضا جیسے عاشقِ صادق کا امتیازی وصفِ خاص ہے۔

امام احمد رضا کی شاعری کا مقصد محبوبِ کردگار ﷺ کی تعریف و توصیف اور آقا ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات ادا کرنے والوں کی مذمت اور تردید کرنا ہے، چناں چہ ارشادِ عالی ہے کہ ؎

زمین و زماں تمہارے لیے مکین و مکاں تمہارے لیے
چنیں و چناں تمہارے لیے بنے دوجہاں تمہارے لیے
دہن میں زباں تمہارے لیے بدن میں ہے جاں تمہارے لیے
ہم آئے یہاں تمہارے لیے اُٹھیں بھی وہاں تمہارے لیے

دشمنِ احمد پہ شدت کیجیے
ملحدوں کی کیا مروت کیجیے
شرک ٹھہرے جس میں تعظیمِ حبیب
اس برے مذہب پہ لعنت کیجیے

اللہ جل شانہ اور اس کے فرشتے رسولِ کائنات ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں کائنات کا ہر ذرّہ آپ ﷺ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں جہاں ذکرِ خدا جاری ہے وہاں وہاں ذکرِ مصطفیٰ بھی ہوتا ہے۔ حضرتِ رضا بریلوی کا خامۂ گل ریز اور فکرِ عشق آمیز جب نعت نگاری کی طرف مائل ہوتی ہے تو آپ کا کمالِ علمی گہر افشانی کرتے ہوئے نعتِ رسول ﷺ میں نت نئے گل بوٹے اس شان سے کھلاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، میدانِ نعت میں آپ کے علمی اصطلاحات سے آراستہ و مزین اشعار صفحۂ قرطاس پر ہماری مشامِ جان و ایمان کو معطر و معنبر کرنے لگتے ہیں۔ امام احمد رضا کی فکرِ رسا نے فضائے نعت میں پرواز کرتے ہوئے انوکھی معنیٰ آفرینی اور جدت و ندرت کی لہلہاتی فصل اگائی ہے اس پر شرح و نقد کرنا مجھ جیسے کم علم کے بس کی بات نہیں۔ ذیل میں کلام رضا سے علمی اصطلاحات پر مشتمل اشعار اور ان کے نیچے اس علم کا عنوان بلا تبصرہ درج کیا جارہا ہے۔ اہلِ علم ان اشعار سے لطف لے سکتے ہیں ؎

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفیٰ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتا کیا ئے کہ یوں
بے سہیم و قسیم و عدیل و مثیل
جوہرِ فردِ عزت پہ لاکھوں سلام
غایت و علت سبب بہرِ جہاں تم ہو سب
تم سے بَنا تم بِنا تم پہ کروروں درود

(علمِ فلسفہ)

وہ گراں سنگیِ قدرِ مِس وہ ارزانیِ جود
نوعیہ بدلا کیے سنگ ولآلی ہاتھ میں

(علمِ فلسفۂ نظری)

بارھویں کے چاند کا مجرا ہے سجدہ نور کا
بارہ برجوں سے جھکا اک اک ستارہ نور کا
سعدین کا قران ہے پہلوے ماہ میں
جھرمٹ کیے ہیں تارے تجلی قمر کی ہے
دنیا، مزار، حشر، جہاں ہیں غفور ہیں
ہر منزل اپنے چاند کی منزل غُفر کی ہے
نبوی ظِل علوی برج بتولی منزل
حسنی چاند حسینی ہے چمکنا تیرا

(علمِ نجوم)

مہرِ میزاں میں چھپا ہو تو حمل میں چمکے
ڈالے اک بوند شب دے میں جو بارانِ عرب
ہیں عکسِ چہرہ سے لبِ گلگوں میں سرخیاں
ڈوبا ہے بدرِ گل سے شفق میں ہلالِ گل
سیاہی مائل اس کی چاندنی ہے
قمر کا یوں فلک مائل ہے یاغوث
طلاے مہر ہے ٹکسال باہر
کہ خارج مرکزِ حامل ہے یا غوث

(علمِ ہیئت)

زبانِ فلسفی سے خَرق و اِلتِیام اسرا
بنایا دورِ رحمت ہاے یک ساعت تسلسل کو
محمد مظہرِ کامل ہے حق کی شانِ قدرت کا
نظر آتا ہے اس وحدت میں کچھ انداز کثرت کا
ممکن میں یہ قدرت کہاں، واجب میں عبدیت کہاں
حیراں ہوں یہ بھی ہے خطا، یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
فرشتے خِدَم رسولِ حِشَم تمامِ اُمَمُ غُلامِ کرم
وجود وعدم حدوث وقدم جہاں میں عیاں تمہارے لیے

(فلسفۂ مابعد الطبعیات)

محیط و مرکز میں فرق مشکل، رہے نہ فاصل خطوطِ واصل
کمانیں حیرت میں سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے تھے
کمانِ امکاں کے جھوٹے نقطو! تم اوّل آخر کے پھیر میں ہو
محیط کی چال سے تو پوچھو، کدھر سے آئے کدھر گئے تھے

(فلسفۂ مابعد الطبعیات و علمِ ہندسہ)

کیا لکیروں میں ید اللہ خط سرو آسا لکھا
راہ یوں اس راز لکھنے کی نکالی ہاتھ میں

(علمِ ہندسہ)

ذرے مہرِ قدس تک تیرے توسط سے گئے
حدِّ اوسط نے کیا صغرا کو کبرا نور کا
تم سے خدا کا ظہور، اُس سے تمہارا ظہور
لِم ہے یہ وہ اِن ہوا تم پہ کروروں دُرود
سببِ ہر سبب، منتہاے طلب
علّتِ جملہ علّت پہ لاکھوں سلام

(علمِ منطق)

ترا منسوب ہے مرفوع اس جا
اضافت رفع کی حامل ہے یا غوث

(علمِ معانی ونحو)

درودیں صورتِ ہالہ محیطِ ماہِ طیبہ ہیں
برستا امتِ عاصی پہ اب رحمت کا پانی ہے
نبوی مینھ علوی فصل بتولی گلشن
حسنی پھول حسینی ہے مہکنا تیرا

(علمِ موسمیات)

نبوی خور علوی کوہ بتولی معدن
حسنی لعل حسینی ہے تجلا تیرا
کوہ سرمکھ ہو تو اک وار میں دو پر کالے
ہاتھ پڑتا ہی نہیں بھول کے اوچھا تیرا

(علمِ ارضیات ومعدنیات)

رشحاتِ رضا بریلوی سے اس قبیل کے اور بھی درجنوں اشعار اخذ کر کے سجائے جا سکتے ہیں، اس مختصر سے مضمون میں اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ وگرنہ علم وفضل کے اس بحرِ ناپیدا کنار کی کماحقہ شناوری کا حق ادا کرنا مجھ جیسے مبتدی کے لیے ہر گز ممکن نہیں۔ یہاں اشعار اور ان کے نیچے علوم و فنون کے نام درج کر دیے گئے ہیں تاکہ اہلِ علم و فہم اس کی گہرائی و گیرائی تک رسائی حاصل کر کے کلامِ رضا بریلوی میں علمی مصطلحات کی جو ضیاباریاں ہیں ان سے کیف و سرور حاصل کریں۔ حضرت امام ہی کے ایک شعر پر تشطیر کرتے ہوئے اس مضمون کا اختتام کرتا ہوں ؎

"ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلم"
دنیاے علم و فن میں ہے شان تیری محکم
عشقِ شہِ دنا کے دریا بہادیے ہیں
"جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں"

مولانا شاہ محمد مصطفیٰ رضا خاں اور ان کے افکار و تعلیمات

پروفیسر ڈاکٹر جلال الدین احمد نوری (شعبۂ علومِ اسلامی جامعہ، کراچی)

مُقتدائے اہلِ سنت، حضرت مفتی اعظم ہند سیدی مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خاں نوری برکاتی بریلوی (قدس سرہ العزیز) ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ / ۷ر جولائی ۱۸۹۳ء بروز جمعہ بریلی انڈیا میں پیدا ہوئے۔ آپ امام احمد رضا بریلوی (علیہ الرحمہ) کے فرزندِ اصغر تھے۔ آپ کی ولادت کا سن ہجری اس آیت کریمہ سے نکلتا ہے۔[۱]

"وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ" (۱۳۱۰ھ)

آپ کا پیدائشی نام "محمد" رکھا گیا؛ جبکہ آپ کے والد امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "آلِ رحمٰن" رکھا اور پیرومرشد مولانا ابوالحسین احمد نوری میاں المارہروی (علیہ الرحمۃ) نے آپ کا نام "ابوالبرکات محی الدین جیلانی" تجویز کیا اور آپ عموماً "مصطفیٰ رضا خان نوری" لکھنا پسند کرتے تھے۔ علمِ فقہ و فتاویٰ میں ملکۂ تامّہ حاصل ہو جانے کی وجہ سے دنیائے اسلام میں "مفتیِ اعظم ہند" کے لقب سے مشہور ہوئے۔[۲]

تعلیم

حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں (علیہ الرحمہ) نے اپنے والدِ ماجد امام احمد رضا بریلوی سے اکثر علوم وفنون میں اسناد حاصل کیں اور دیگر علوم وفنون کی بعض اعلیٰ کتابیں اپنے بڑے حقیقی بھائی حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی (المتوفّٰی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) سے پڑھیں، اس کے علاوہ استاذالاساتذہ حضرت علامہ الشاہ رحم الٰہی منگلوری اور حدیث شریف کا درسِ خاص حضرت علامہ ظہور الحسین فاروقی رامپوری (المتوفّٰی ۱۳۴۲ھ) تلمیذ مولانا محمد فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے حاصل کیا اور جملہ علوم میں فراغت اپنے والدِ ماجد امام احمد رضا سے حاصل کی پھر آپ کو ۲۵ سلاسلِ اولیا اور سلاسلِ احادیث کی اجازت مرحمت فرمائی۔[۳]

کچھ مدت کے بعد آپ کو جامعہ منظر اسلام بریلی میں مدرس رکھ لیا گیا، چنانچہ آپ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء سے ۱۳۵۶ھ /۱۹۳۷ء تک جامعہ رضویہ منظر اسلام میں تدریس کے منصب پر فائز رہے تھے۔

اس تدریسی عمل نے آپ کو درس نظامی کا ایک ماہر فکر ساز مدرس، بالغ نظر محدث، عظیم فقیہہ اور متکلم بنادیا۔ پاک وہند کی اکثر جامعات اور مدارس میں آپ کے تلامذہ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ یہ ایک ایسا صدقۂ جاریہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔ آپ کے اجل تلامذہ وخلفا کی ایک انتہائی طویل فہرست ہے جن کے فیض نظر سے پاک وہند کے سیکڑوں مدارس اہلِ سنّت اور عوام مستفیض ہوئے اور ہورہے ہیں اِن میں:

1۔ فقیہہِ عصر مولانا اعجاز ولی خاں رضوی علیہ الرحمۃ محدث، فقیہہ، مفتی، لاہور
2۔ مناظرِ اعظمِ ہند مولانا حشمت علی خاں رضوی پیلی بھیتی رحمۃ اللہ علیہ مدرس و مناظر۔
3۔ مولانا محمد ضیاء المصطفیٰ رضوی امجدی شیخ الحدیث، مدرس دارالعلوم اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ۔
4۔ مولانا محمد ابراہیم خوشتر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ بانی سنی رضوی انٹرنیشنل سوسائٹی، مانچسٹر (لندن)۔
5۔ محدث اعظم پاکستان مولانا مفتی سردار احمد رضوی رحمۃ اللہ علیہ محدث، مفتی و مدرس فیصل آباد۔
6۔ بحر العلوم مفتی عبدالمنان اعظمی سابق نائب شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ، انڈیا۔
7۔ مفتی محمد رجب علی رضوی نانپاروی رحمۃ اللہ علیہ، بانی مدرس عزیز العلوم نانپارہ، ضلع بہرائچ، یوپی، انڈیا۔
8۔ فقیہہ الہند مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ شارح بخاری، مبارکپور اعظم گڑھ، انڈیا۔
9۔ استاذ العلماء مفتی خواجہ حسین رضوی شیخ المعقولات، مدرس مدرسۂ قادریہ، بدایوں۔
10۔ مولانا ابراہیم رضا خاں جیلانی بریلوی (علیہ الرحمہ)، انڈیا۔
11۔ مولانا تحسین رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، انڈیا۔
12۔ مولانا ریحان رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، انڈیا۔

13۔ مولانا مفتی اختر رضا خاں بریلوی مدظلہ، انڈیا۔
14۔ مولانا خالد علی خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ۔
15۔ مولانا سبطین رضا خاں بریلوی مدظلہ۔
16۔ مولانا توصیف رضا خاں بریلوی مدظلہ۔
17۔ مولانا عبدالحفیظ صاحب مراد آبادی مدظلہ، الجامعۃ الاشرفیہ۔
18۔ علامہ ارشد القادری صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جامعہ نظام الدین، دہلی۔
19۔ مولانا غلام جیلانی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ العلماء، دارالعلوم فیض الرسول، براؤن، ضلع بستی یوپی۔
20۔ مولانا نعیم الدین صدیقی گورکھپوری رحمۃ اللہ علیہ، مدرس فیض الرسول، براؤن، ضلع بستی۔
21۔ مولانا بدرالدین احمد قادری، مدرس فیض الرسول، ضلع بستی انڈیا
22۔ حضرت مولانا قاری محمد مصلح الدین صدیقی (علیہ الرحمۃ) کراچی
23۔ مولانا شاہ سید تراب الحق قادری مدظلہ، کراچی۔
24۔ مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ، لاہور۔
25۔ مولانا مفتی محمد حسین سکھر والے (علیہ الرحمہ)
26۔ مولانا مفتی سید افضل حسین مونگری رحمۃ اللہ علیہ۔
27۔ مولانا مفتی غلام سرور، لاہور۔
28۔ مولانا مفتی فیض احمد اویسی، بہاولپور
29۔ مولانا صفی احمد رضوی، حال مقیم برمنگھم، لندن
30۔ علامہ سید محمد مغربی مالکی رحمۃ اللہ علیہ۔
31۔ علامہ جعفر بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ۔
32۔ مولانا سید عباس مالکی رحمۃ اللہ علیہ۔
33۔ مولانا ابراہیم مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔
34۔ علامہ فضل الرحمٰن مدنی (ابن مولانا ضیاء الدین مدنی علیہ الرحمۃ)۔
35۔ مولانا سید امین قطبی مکی رحمۃ اللہ علیہ۔
36۔ مولانا عمر، ہمدان مکی رحمۃ اللہ علیہ۔
37۔ علامہ مزروقی، مکی رحمۃ اللہ علیہ۔
38۔ خادم نوری بھی شرف نسبت رکھتا ہے۔

فتویٰ نویسی

مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی نوری المعروف مفتی اعظم ہند نے فتویٰ نویسی اور تدریسی کام کا آغاز ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء سے کیا اور پہلا فتویٰ جو مسئلۂ رضاعت سے متعلق تھا جس کا جواب آپ نے لکھا اور اپنے والد ماجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی خدمت میں برائے تصدیق پیش کیا اور اعلیٰ حضرت نے اس جواب کو بہت پسند کیا اور اسی وقت "ابوالبرکات محی الدین جیلانی آل رحمٰن عرف محمد مصطفیٰ رضا" کے نام کی مہر بنوا کر آپ کو عطا کی اور "دارالافتاء" کا کام بھی آپ کے سپرد کیا۔ یہ بھی عجب حسن اتفاق ہے کہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ نے بھی ۱۴ سال کی عمر شریف میں پہلا فتویٰ مسئلۂ رضاعت سے متعلق لکھا، جس کو آپ کے والد مولانا مفتی نقی علی خاں (علیہ الرحمہ) نے جب دیکھا تو فرطِ محبت سے پیشانی چوم لی تھی اور آپ کو "دارالافتاء" کی ذمّے داری سپرد کر دی گئی تھی۔

اور جیسا کہ ابھی گزرا کہ مفتی اعظم ہند نے اپنے والد ماجد اعلیٰ حضرت کی حیات میں ہی فتاویٰ نویسی کا آغاز کر دیا تھا اور عمر کے آخری ایام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح لگ بھگ ۷۰ برس مسلسل فتاویٰ نویسی اور ساتھ ہی تدریس فرائض بھی آپ نے انجام دیے۔ اس دوران لاکھوں فتاویٰ جمع ہو گئے جس کی اب تک صرف دو جلدیں ہی بنام (فتاویٰ مصطفویہ) زیورِ طبع ہو سکی ہیں اور دیگر فتاویٰ بھی اب جمع کیے جا رہے ہیں۔

تصانیف

فتاویٰ کے علاوہ آپ کی ایک کثیر تعداد تصنیفات کی بھی ہے، جن میں سے چند شائع ہو چکی ہیں اور زیادہ تر قلمی صورت میں تاہنوز مخزن مخطوطات بریلی میں محفوظ ہیں چند نام مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ القول العجیب فی جواز التثویب (بعد اذان صلوٰۃ و سلام پکارنے کے بارے میں علماءِ عرب و عجم کا قول فیصل)، مطبوعہ۔
2۔ القسورۃ علی ادوار الحمر الکفرۃ (۱۳۴۳ھ) لیڈروں کے بعض کفری اقوال کا ردِّ بلیغ۔
3۔ طُرقُ الھدیٰ والا رشاد الیٰ احکام الامارۃِ والجھاد (۱۳۴۱ھ) یہ کتاب مسئلۂ خلافت، جہاد و ترکِ موالات اور ہندو مسلم اتحاد کے مسائل پر ایک بے مثال کتاب ہے۔
4۔ سوراخ در سوراج (۱۳۴۱ھ) خلافتی لیڈروں کی غیر شرعی حرکات اور ہندوؤں کی باطنی خباثت کا ردِّ بلیغ۔

5۔ مقتل کذب و کید (۱۳۳۲ھ) مسئلۂ اذان سے متعلق مخالفین پر ایک ہزار ضرب۔

6۔ دوامُ العَیش فی الائمۃِ من قریش (۱۳۳۹ھ) مصنفہ اعلیٰ حضرت (قدس سرہٗ) پر عمدہ نفیس و سلیس تمہید اور تازہ اضافات وافادات۔[۴]

7۔ العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ (کتاب نکاح وطلاق) کی تصحیح فرمائی اور اضافہ و فوائد کے ساتھ ۲۷۔۱۹۲۶ء میں پہلی بار حسنی پریس بریلی سے شائع کرائی۔

8۔ الاستمداد علیٰ اجیال والارتداد (۱۳۳۷ھ) کے حواشی و تکملات۔

9۔ الملفوظ (چہار حصوں میں) اعلیٰ حضرت (قدس سرہ) کے ملفوظات جس میں طریقت وحقیقت اور دیگر کئی مسائل کے جوابات ملتے ہیں۔ ۱۳۳۷ھ مطبوعہ لاہور۔

10۔حجۃ الواھرہ بوجوب الحجۃ الحاضرۃ، مطبوعہ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی، ۱۳۴۲ھ۔ یہ کتابچہ گمراہ کن فتویٰ کا جواب ہے جو اعلیٰ حضرت (قدس سرہ) نے اصل مسئلہ، قرآن وحدیث اور فقہ سے واضح کیا، مگر جناب مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ذکر کسی انداز میں بھی نہیں کیا گیا تھا اور جب تصدیق کے لیے مفتی اعظم ہند کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا تھا کہ تھانوی صاحب تو ''سرغنہ دیوبندیہ ہیں'' ان کا استثناء عجیب ہے؟ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسائل مذکور میں مولوی حاکم علی صاحب کی دین پرستی نے انہیں حق کے قبول کرنے پر آمادہ کیا اور یہ فتویٰ ''جمعیت علماءِ ہند'' نے شائع کیا۔[۵] الحمدللہ والمنۃ کہ یکم نومبر ۱۹۲۰ء کو جناب پروفیسر حاکم علی صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ عالی جناب مؤیدِ ملّت طاہرہ مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب قادری بریلوی کا فتویٰ موصول ہوا، اس سے مجھے ٹھیک ٹھیک پتا لگا کہ مولوی اشرف علی صاحب تو سرغنہ دیوبندیہ ہیں، یااللہ میری توبہ۔[۶] راقم کی رائے میں پروفیسر صاحب موصوف نے اسی جملے سے حضرت مفتی اعظم ہند کے دینی جذبے کا بخوبی اندازہ لگالیا۔

مفتی اعظم کا حلیہ مبارکہ

آپ کا قدمبارک دراز، چہرہ گول، روشن و تابناک، جس سے نور برستا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی چمکدار، گہرائی و گیرائی لیے ہوئے بھنویں گنجان، ہالہ لیے ہوئے، پلکیں گھنی بالکل سفید، انگشت سفید گندمی، ریش مبارک گھنی مسترسل سفید و نرم ریشم کی طرح، مونچھ نہ بہت پست نہ اٹھی ہوئی، ناک متناسب درازی لیے ہوئے، رخسار بھرے ہوئے گداز، جلال و جمال کا آئینہ دار۔ سر بڑا، گول پیشانی کشادہ ابھری ہوئی تقدس کے آثار لیے ہوئے۔ لب پتلے گلاب کی پتی کی طرح تبسم کے آثار لیے ہوئے۔ دندانِ مبارک چھوٹے چھوٹے ہموار موتیوں کی لڑی کی طرح۔ گردن معتدل، سینہ فراخ کچھ روئیں لیے ہوئے۔ کمر خمیدہ مائل، ہاتھے لمبے لمبے جو سخاوفیاضی میں ضرب المثل۔ انگلیاں لمبی لمبی موزوں وکشادہ، ہتھیلیاں بھری ہوئیں گداز۔ کلائیاں چوڑی روئیں دار۔ پاؤں متوسط ضعف کا اثر لیے ہوئے۔ ایڑیاں گول موزوں۔ لباس عمامہ بڑے عرض کا زیادہ تر سفید بادامی پوشاک، کرتہ کلی دار، پاجامہ علی گڑھ۔ جوتا ناگرہ، جے پوری۔ یہ تھے آفتابِ علم و معرفت، ماہتابِ رشد و ہدایت، واقفِ اسرارِ شریعت، دانائے رموز و حقیقت، تاجدارِ اہلِ سنت، جامع معقول ومنقول، ہادی فروع واصول، محدثِ اکمل، فقیہہ، حضور سیدی مفتی اعظم ہند مولانا الحاج الشاہ ابوالبرکات محی الدین جیلانی آل رحمٰن محمد مصطفیٰ رضا خاں نوری بریلوی قدس سرہ العزیز۔ آپ کے حوالے سے محدث اعظم ہند کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے بمبئی میں اپنے خطاب میں فرمایا تھا: آج کل دنیا میں جن کا فتویٰ سے بڑھ کر تقویٰ ہے یہ ایک شخصیت مجدد مائۃ حاضرہ کے فرزندِ دلبند کا پیارا نام مصطفیٰ رضا کا ہے جو بے ساختہ زبان پر آتا ہے اور زبان بے شمار برکتیں لیتی ہے۔ نور چشم اعلیٰ حضرت راحت دل حضور مفتی اعظم ہند کے ایک شرعی فتویٰ پر محدث اعظم ہند کچھ اس طرح تحریر فرماتے ہیں: ھذا اقول العالم المطاع وما علینا الاالاتباع۔ ترجمہ: (یعنی ایک ایسے عالم کا قول ہے جن کی اطاعت لازم ہے۔)

حضرت مولانا مفتی غلام محمد خاں صاحب شیخ الحدیث جامعہ امجدیہ ناگپور ۱۹۵۳ء سے پہلے کسی سے مرید نہیں ہوئے تھے۔ کسی بھی سلسلے میں وابستہ ہونے کے لیے بے چین تھے۔ آخر کار ایک دن ہندوستان کے مشہور عالم حضرت علامہ مفتی عبدالرشید صاحب (بانی جامعہ امجدیہ ناگپور) سے دریافت فرمایا کہ حضور! مرید ہونے کے لیے بے چین ہوں کس سے مرید ہونا چاہیے؟ تو حضرت نے ارشاد فرمایا: مولانا! اب کہاں ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو شریعت وطریقت میں کامل ہوں سوائے مفتی اعظم ہند کے۔[۸]

3۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ: اپنے شہر میں کسی کو عزت و مقبولیت نہیں ملتی لیکن حضور مفتی اعظم ہند کو اپنے دیار میں جو عزت و مقبولیت حاصل ہے اس کی مثالیں کہیں نہیں ملتیں۔[9]

4۔ حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ نے فرمایا: اس دور میں ان کی ہستی فقید المثال ہے۔ خصوصیت کے ساتھ بابِ افتاء میں بلکہ روز مرہ کی گفتگو میں جس قدر محتاط اور موزوں الفاظ اور قیود ارشاد فرماتے ہیں اہل علم ہی ان کی قدر و منزلت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

5۔ غزالی دوراں علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: سیدی مفتی اعظم ہند کی شان اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ حضرت ممدوح امام اہلِ سنّت، مجدد دین و ملت مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے لختِ جگر اور جانشین ہونے کے ساتھ الولد سر لابیہ کے سچے مصداق تھے۔[10]

6۔ مولانا قاری محمد مصلح الدین الصدیقی فرماتے تھے: حضرت سیدی و مرشدی صدرالشریعہ بدر الطریقہ کے وصال کے بعد میری تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز حضور مفتی اعظم ہند ہی کی ذات تھی اور وہ میرے ہی کیا تمام سنیوں کی تمناؤں کا مرکز تھے۔[11]

7۔ حضور شمس العلما مولانا شمس الدین جون پوری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ان کی خدمت میں جب حاضر ہوتا ہوں تو سر جھکا کر بیٹھا رہتا ہوں اور خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتا ہوں۔ ان سے زیادہ بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔[12]

8۔ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ (صدر جمعیت علمائے پاکستان) فرماتے تھے کہ مفتی اعظم ہند علم و فضل اور فقہی بصیرت کے اعتبار سے لاثانی تھے۔ اسلام اور عالمِ اسلام کے لیے آپ کی عظیم خدمات ناقابل فراموش ہیں۔[13]

1۔ خلیفۂ اعلیٰ حضرت، حضرت مولانا شاہ ضیاء الدین احمد مدنی علیہ الرحمہ فرماتے تھے: مفتی اعظم ہند، مفتی اعظم تھے۔[14]

2۔ حضرت استاذی علامہ عبدالمصطفیٰ صاحب ازہری رحمۃ اللہ علیہ پاکستان فرماتے تھے: مفتی اعظم امانت، دیانت، شفقت اور تواضع وانکساری کا عظیم پیکر تھے۔[15]

3۔ حضرت مولانا مختار اشرف اشرفی جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین کچھوچھہ شریف علیہ الرحمۃ فرماتے تھے: حضرت مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ بلاشبہ ان اکابرین میں سے تھے جو دینِ اسلام اور افکارِ اہلِ سنّت کو فروغ دینے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت کی پوری زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ خلوص وللّٰھیت ان کی شخصیت کا ٹریڈ مارک تھا۔ ان کا کوئی قول یا عمل میری نگاہ میں ایسا نہیں ہے جو خلوص وللّٰھیت سے خالی ہو۔ وہ اگر ایک طرف متبحر عالم دین مستند اور معتبر فقیہہ، مختلف علوم فنون کے ماہر اور شعر وادب کے مزاج آشنا تھے تو دوسری جانب ریاضت، عبادت، مکاشفہ و مجاہدہ اور اسرارِ باطنی کے بھی محرمِ راز تھے۔ وہ ایک ایسی شمع تھے جس کے گرد لاکھوں پروانے اکتسابِ فیض کی خاطر زندگیوں کو داؤ پر چڑھائے رہتے تھے۔ میرے گھرانے کے بزرگوں سے ان کے دیرینہ اور گہرے تعلقات تھے۔ اسی پس منظر میں مجھے ان کا قربِ خاص حاصل تھا۔[16]

حوالہ جات

۱۔ تذکرہ خلفاءِ اعلیٰ حضرت، ص ۱۸۴، مطبوعہ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا، کراچی ۱۹۹۲ء۔
۲۔ مفتیِ اعظم ہند اور ان کے خلفا، ص ۲۶، مولانا شہاب الدین رضوی، ۱۹۹۰ء۔
۳۔ ایضاً، ۶۳۔
۴۔ یہ رسالہ دو قومی نظریہ پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے اور ہندو کیا ہے؟ حقائق سمجھنے میں پوری مدد کرتا ہے۔(نوری)
۵۔ المحجۃ المؤتمنہ، ص ۶۔
۶۔ مفتی اعظم ہند نمبر، ماہنامہ استقامت، ص ۵۵۷/۵۵۸۔
۷۔ حیاتِ فاضلِ بریلوی، ص ۱۲۲، مؤلفہ ڈاکٹر محمد مسعود احمد رحمۃ اللہ علیہ۔
۸۔ مفتی اعظم ہند نمبر، ماہنامہ استقامت، کانپور، ص ۵۵۷ تا ۵۵۸۔
۹۔ ایضاً، ص ۸۔
۱۰۔ مفتی اعظم ہند نمبر، استقامت، کانپور۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۵۵۹۔
۱۲۔ ایضاً۔
۱۳۔ مفتی اعظم ہند نمبر، ماہنامہ استقامت، کانپور۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۴۔
۱۵۔ مفتی اعظم ہند نمبر، ماہنامہ، استقامت، کانپور۔
۱۶۔ مفتی اعظم ہند نمبر، ماہنامہ استقامت، کانپور۔

[یادگاری تحقیقی لیکچر ۲۰۰۷ء، بیاد مولانا شاہ محمد مصطفیٰ رضا خاں البریلوی، زیر اہتمام: امام ابو حنیفہ اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ، پاکستان]

مکتوباتِ سید محمد ریاست علی قادری بنام سید نور محمد قادری

ترتیب: **سیّد محمد عبد اللہ قادری** (واہ کینٹ، پاکستان)

صاحبِ فیضِ رضا سید محمد ریاست علی قادری ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کے بانی تھے۔ رضویات کے فروغ کے لیے آپ محققین و اسکالرز سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ معروف محقق سید نور محمد قادری کو لکھے گئے آپ کے مکتوبات اس گزارش کے ساتھ یہاں پیش کیے جارہے ہیں کہ قارئین کے علم میں سید ریاست علی قادری اور رضویات کے حوالے سے دیگر مشاہیر کے جو مکتوبات و آثار ہیں ان کے عکس ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کو مہیا کریں ہم ان کو مناسب انداز میں معارفِ رضا کے صفحات پر شائع کریں گے۔

سیّد محمد ریاست علی قادری بریلوی

حضرت سیّد ریاست علی قادری رضوی بریلوی علیہ الرحمۃ ۲۷ جون ۱۹۳۲ء کو محلہ شاہ آباد بریلی شریف کے ایک علمی سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول بریلی سے میٹرک پاس کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کرکے کراچی تشریف لے آئے۔ ایس ایم کالج میں باقی تعلیم حاصل کی۔ آپ کو اردو، انگریزی اور جرمن زبان پر عبور حاصل تھا۔ ۱۹۵۶ء میں بریلی شریف گئے تو وہاں مفتیِ اعظم ہند حضرت مولانا محمد مصطفیٰ رضا خاں کی صحبت میسر آئی، تو سلسلۂ قادریہ میں اُن سے بیعت ہوئے آپ کو آستانۂ رضویہ سے پہلے ہی محبت وعقیدت تھی۔ آپ کے والدِ ماجد حضرت سید محمد واحد رضوی علیہ الرحمۃ کو بھی اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا خاں بریلوی (م ۱۹۲۱ء) سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ ۱۹۷۹ء میں بریلی شریف گئے، تو مفتیِ اعظم نے اجازت وخلافت سے نوازا۔ ۱۹۸۷ء میں نواسۂ اعلیٰ حضرت مفتی محمد تقدس علی خاں نے بھی اجازت و خلافت سے نوازا۔

آپ صحافی و ادیب، مقرر، مضمون نگار، مقالہ نگار، محقق و مبصر تھے۔ جس زمانے میں اسلام آباد رہے وہاں ''مسجد الحسین'' میں خطیب رہے۔ آپ نے چند مخلص ساتھیوں کے تعاون سے، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا، کی بنیاد ۱۹۸۰ء میں رکھی۔ ادارے کے ذریعے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی کی تعلیمات کو روشن کروانے کا تہیہ کیا۔ آج تک ادارہ بڑے جوش وخروش سے یہ کام سرانجام دے رہا ہے۔ ادارے نے ایک مجلہ، معارف رضا، بھی شائع کرنا شروع کردیا۔ ادارہ ہر سال کراچی، اسلام آباد میں امام احمد رضا کانفرنس منعقد کرواتا ہے۔

سیّد ریاست علی قادری، صاحبِ تصنیف بزرگ تھے:

- ☆ سالنامہ، معارف رضا، کراچی (جلدِ اوّل تا ہفتم)
- ☆ مفتیِ اعظم ہند
- ☆ امام احمد رضا کے نثری شہ پارے
- ☆ امام احمد رضا اور علومِ جدیدہ (غیر مطبوعہ)
- ☆ لوگارثم (محشی امام احمد رضا)
- ☆ مجلہ سیرت کانفرنس، اسلام آباد
- ☆ امام احمد رضا اور عالمِ اسلام
- ☆ تحریکِ آزادیِ ہند
- ☆ عظمتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
- ☆ مجلہ عظمت اولیاء کانفرنس کراچی۔

سید ریاست علی قادری، ٹیلی فون انڈسٹریز آف پاکستان میں ملازم تھے۔ آپ نے اسلام آباد میں قیام کے دوران ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کی ایک شاخ بھی قائم کی۔ ہر سال امام احمد رضا کانفرنس، اسلام آباد ہوٹل میں کرواتے تھے۔

انتقال: ۲۷ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ایک اہم میٹنگ میں شرکت کی غرض سے کراچی گئے۔ ۳ جنوری ۱۹۹۲ء کو بذریعہ ٹرین راولپنڈی/اسلام آباد پہنچے، دورانِ سفر دل کا دورہ پڑا۔ گھر پہنچے تو اہل خانہ نے پولی کلینک ہسپتال میں داخل کروایا۔ مگر افاقہ نہ ہوا؛ بلکہ، یہ دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ جمعۃ المبارک کی شام کو اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اُسی دن کو صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری، پروفیسر مجید اللہ قادری، حاجی محمد حنیف طیب، اور سید اویس علی بریلوی بن سید ریاست علی قادری، اُن کے جسدِ خاکی کو کراچی لے گئے۔ حضرت شاہ تراب الحق قادری نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ سخی حسن قبرستان میں سپردِ خاک کردیا گیا۔

سیّد نور محمد قادری

نامور محقق و نقاد، ماہرِ اقبالیات، وضویات سیّد نور محمد قادری بن حافظ سید محمد عبداللہ قادری (مئی ۱۹۲۵ء۔ نومبر ۱۹۹۶ء) چک ۱۵ شمالی، تحصیل پھالیہ ضلع گجرات، منڈی بہاء الدین میں پیدا ہوئے۔ آپ ساداتِ بخاری سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ ماجد حافظ سید محمد عبداللہ شاہ قادری بن مولوی سید محمد چراغ شاہ سیالکوٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں اسلامیہ ہائی اسکول واڑہ عالم شاہ ضلع گجرات سے میٹرک کا امتحان پہلی پوزیشن میں پاس کیا۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۳ء اسی اسکول میں مدرس رہے۔ ۱۹۴۵ء میں سلسلۂ قادریہ میں اپنے خاندان کے روحانی پیشوا حضرت قاضی سلطان محمود قادری (م ۱۹۱۹ء) آوان شریف ضلع گجرات کے برادر زادہ و خلیفۂ مجاز حضرت صاحبزادہ قاضی محبوب عالم قادری (م ۱۹۸۲ء) کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔

۱۹۴۵ء تا ۱۹۷۲ء تک شعر، ادب، اسلامیات اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ اُن کی پہلی کتاب ''نقوشِ محبت'' (شعری انتخاب) ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی، جس کا تعارف شریف کنجاہی صاحب نے تحریر کیا۔ اس کے علاوہ آپ حسبِ ذیل کتب کے مصنف ہیں:

☆ اعلیٰ حضرت کی شاعری پر ایک نظر
☆ اعلیٰ حضرت کی سیاسی بصیرت
☆ اقبال کا آخری معرکہ
☆ حضرت قاضی سلطان محمود قادری
☆ اقبال کے دینی اور سیاسی افکار
☆ سید احمد بریلوی کے خانہ جہاد کی حقیقت
☆ قطب العارفین (حضرت قاضی سلطان محمود قادری)
☆ میلاد شریف اور علامہ محمد اقبال
☆ اُردو کی بہترین نعتیہ غزلیں
☆ مولانا عبد الحامد بدایونی کی ملّی و سیاسی خدمات۔

سید نور محمد قادری علیہ الرحمۃ نے اپنی تمام عمر خدمتِ علم و ادب اور تحقیق میں گزار دی۔ انھوں نے امام احمد رضا بریلوی، علامہ محمد اقبال، حضرت قاضی سلطان محمود قادری، قائدِ اعظم، تحریکِ پاکستان پر جتنا لکھا وہ مستند لکھا۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری (م نومبر ۱۹۹۹ء) فرماتے ہیں ''میرے کرم فرما محققین میں سے حضرت سید نور محمد قادری اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی امام احمد رضا بریلوی اور علامہ محمد اقبال پر تحقیق کے لیے وقف کر رکھی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ پاکستان کے اہلِ سنّت وجماعت میں سے اس وقت یہ واحد بزرگ ہیں جنہیں اقبالیات پر عبور حاصل ہے اور انہوں نے امام احمد رضا اور علامہ محمد اقبال پر جو کچھ لکھا ہے وہ سند کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (مکتوب حکیم محمد موسیٰ امرتسری لاہور بنام راقم، محررہ ۴ جنوری ۱۹۸۶ء)

سیّد نور محمد قادری، ایک بہت اچھے ذاتی کتب خانے کے مالک تھے۔ اب وہ کتب خانہ راقم الحروف کی ملکیت ہے، جس میں نادر ونایاب کتب ورسائل موجود ہیں؛ مشاہیر کے سینکڑوں خطوط موجود ہیں۔ آج کی نشست میں حضرت سید محمد ریاست علی قادری بریلوی رضوی کے خطوط قارئین معارفِ رضا کی نذر کیے جارہے ہیں، جن کے مطالعے سے بہت سی یادیں تازہ ہوں گی۔

سیّد نور محمد قادری، چند بار سیّد محمد ریاست علی قادری سے ملے تھے۔ وہ جب کبھی چک ۱۵ شمالی سے واہ کینٹ میرے پاس تشریف لاتے تو میں انہیں ان کے پاس لے جاتا۔ میں خود بھی ان سے کئی بار ملا۔ سید محمد ریاست علی قادری کے ہاں گھنٹوں ملاقات رہتی اور کھانا وہیں کھاتا۔ سید محمد ریاست علی قادری کی دعوت پر امام احمد رضا کانفرنس، منعقدہ اسلام آباد میں شریک ہوا۔ سید نور محمد قادری کے اہلِ علم سے گہرے علمی روابط تھے۔ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کے بانی سیّد محمد ریاست علی قادری، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، سید وجاہت رسول قادری وغیرہم سے گہری چھنتی تھی۔

سید نور محمد قادری کے حکیم محمد موسیٰ امرتسری سے گہرے روابط تھے، جو ۱۹۶۸ء تا ۱۹۹۶ء تک برقرار رہے۔ راقم الحروف کو بھی حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ کے ہاں ستمبر ۱۹۸۱ء تا نومبر ۱۹۸۳ء رہنے کا موقع میسر رہا۔ حکیم صاحب نے مرکزی مجلسِ رضا رجسٹرڈ لاہور کے ذریعے، اعلیٰ حضرت بریلوی کی تعلیمات کو روشناس کرانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔

سید نور محمد قادری، ۱۵/نومبر ۱۹۹۶ء کو ۲۰۲ ایف ۲۲۵ واہ کینٹ میں رحلت فرماگئے۔ اُسی شام ان کو چک ۱۵ شمالی ضلع منڈی بہاء الدین پنجاب پاکستان میں اُن کے والدِ ماجد کے پائیں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ نمازِ جنازہ راقم (سید محمد عبداللہ قادری) نے خود پڑھائی۔

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۰ مئی ۱۹۸۰ء

محترم ومکرم جناب قبلہ سید نور محمد قادری صاحب

السلام علیکم!

نوازش نامہ ملا۔ شکریہ، اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیریت ہوں گے۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں "مفتی اعظم ہند" روانہ کر دی ہے۔ ملنے پر مطلع فرمائیں۔ "لوگارثم" کے بعد انشاء اللہ العزیز اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے کچھ اور ریاضی پر حواشی ہیں، منظرِ عام پر لانے کا خیال ہے۔ اُن پر ابھی مختلف حضرات علما اور دانشور کام کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد آنے کی اُمید ہے۔ دعا فرمائیں۔

سیّد الطاف علی بریلوی سگے نہیں بلکہ رشتے کے ماموں ہیں۔ سید ایوب علی صاحب مرحوم ومغفور بھی سگے نہیں بلکہ رشتے کے خالو ہیں۔

فقط والسلام

سید ریاست علی قادری رضوی بریلوی

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۵ مئی ۱۹۸۰ء

محترم ومکرم جناب سید نور محمد قادری صاحب مدظلہ العالیٰ

السلام علیکم!

نوازش نامہ ملا "مفتی اعظم ہند" پر آپ کے احساسات اور جذبہ قابل قدر ہے۔ آپ نے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور جن مفید مشوروں سے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ انشاء اللہ العزیز دوسرے ایڈیشن کے موقع پر آپ کے ارشادات اور مشوروں کی روشنی میں کتاب کو آراستہ کرنے کی پوری سعی کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے صدقہ وطفیل آپ جیسے مخلص حضرات کے اس طرح قیمتی مشوروں سے نوازتا رہے! آمین۔

حیاتِ اعلیٰ حضرت مرتبہ مولانا ظفرالدین بہاری کی دوبارہ اشاعت کے سلسلے میں احباب سے ذکر کروں گا۔

"منظر قیامت" کے بارے میں معلومات حاصل کر کے انشاء اللہ آپ کو مطلع کروں گا۔ کتاب "مفتیِ اعظم ہند" انشاء اللہ اس دفعہ بڑے سائز پر ہی طبع ہوگی۔ میرا ارادہ بریلی شریف جانے کا ہے تاکہ کتاب کے سلسلے میں مزید مواد جمع ہو سکے اور حضرت سے نیاز حاصل ہو جائے۔

آپ نوائے وقت کے ملی ایڈیشن کی تاریخیں لکھ کر روانہ کر دیں تاکہ اُن پرچوں کو حاصل کر کے آپ کا مضمون "ترک موالات" پڑھ سکوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ گاہے بگاہے فقیر کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔

والسلام فقط

فقیر سید ریاست علی قادری بریلوی

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۸، جون ۱۹۸۱ء

السلام علیکم!

اُمید ہے مزاج گرامی بخیریت ہوں گے بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے ہوں۔ اعلیٰ حضرت کے عرس کے موقع پر ادارۂ معارف رضا گزشتہ سال کی طرح ایک مجلہ بنام "معارف رضا" نکالنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اعلیٰ حضرت کی سیرتِ پاک پر یا جس موضوع پر اعلیٰ حضرت سے متعلق آپ مقالہ لکھنا پسند فرمائیں ادارے کے لیے دو ماہ کے اندر بھیج دیں تاکہ کتابت وطباعت وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے جلد اس کو اشاعت کے لیے دے دیا جائے۔

اُمید ہے آپ میری اس درخواست پر خصوصی توجہ فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں گے۔

والسلام فقط

فقیر سیّد ریاست علی قادری بریلوی

(۴)

۷۸۶
۹۲

۹ اگست، ۱۹۸۱ء

محترمی ومکرمی جناب قبلہ سید نور محمد قادری دامت برکاتہم!

السلام علیکم!

۲۵ جولائی کا لکھا ہوا محبت نامہ آج موصول ہوا۔ مقالہ بھیجنے کا بے حد شکریہ انشاء اللہ العزیز معارفِ رضا میں شامل اشاعت ہو گا۔ آپ کی دونوں کتابیں بھی مل گئی ہیں "اعلیٰ حضرت کی شاعری پر

ایک نظر" اس سے پہلے بھی پڑھ چکا ہوں دوبارہ پڑھ کر ایمان میں تازگی آئی۔ پروفیسر محمد مسعود صاحب سے تقریباً ہر ہفتہ ملاقات ہوتی ہے۔

آپ کا مقالہ "اعلیٰ حضرت رضا کی ایک نعت کا قدیم متن" بہت پسند آیا۔ ہمارے قارئین حضرات یقیناً اس مقالے کو پڑھ کر خوش ہوں گے۔ آپ نے یہ مقالہ لکھ کر ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے، جس کے لیے ہماری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے۔ گلزارِ نعت میں اعلیٰ حضرت رضا کے کلام کا قدیم متن ضرور شائع کرائیں۔ ہم سب منتظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے! آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

معارف رضا کے مضامین کے بارے میں آپ کے گراں قدر خیالات کا بے حد شکریہ۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ حضرت شمس بریلوی نے بھی اس تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے مقالے کو کتابی صورت میں لکھ لیا ہے، جو بہت جلد منظر عام پر آجائے گا اور جس کو مولانا شاہ تراب الحق قادری صاحب شائع کرانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ چودہ صفحات پر مشتمل مقالہ تشنہ ہے۔ حضرت شمس صاحب نے اسی مقالے کو تقریباً سو ۱۰۰ صفحات پر پھیلا دیا ہے اور بھرپور مفصل مقالہ لکھ کر لوگوں کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا ہے۔

مولانا اطہر نعیمی صاحب اس دفعہ انشاء اللہ ایک مکمل اور ٹھوس مقالہ اعلیٰ حضرت پر تحریر کر رہے ہیں۔ آپ یقیناً اُس کو پڑھ کر بے حد محظوظ ہوں گے۔ "اعلیٰ حضرت کی چند نعتوں کا ابتدائی متن" تیار ہونے پر ضرور بھیج دیجیے گا۔ انشاء اللہ کوشش کروں گا کہ اُس کو یہاں چھپوا دیا جائے۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو آپ کے اس مقالے پر حضرت شمس بریلوی سے مقدمہ لکھوا کر شاملِ اشاعت کر دیا جائے۔

فتاویٰ رضویہ کے جس زیر طبع ایڈیشن کا عکس معارفِ رضا میں شامل ہوا ہے وہ بریلی میں نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا منان رضا خاں صاحب چھپوا رہے ہیں ادارے کا نام "ادارۂ تصنیفات امام احمد رضا" ہے جو محلہ سوداگران بریلی میں پچھلے دو سال ہوئے قائم ہوا ہے اور جس نے اعلیٰ حضرت کی غیر مطبوعہ کتب کو چھپوانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ انشاء اللہ العزیز بہت جلد ایک کتاب مولفہ پروفیسر محمد مسعود احمد بعنوان "امام احمد رضا اور عالمِ اسلام" منظر عام پر آنے والی ہے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں میری مدد فرمائے چونکہ اس کے چھپوانے کا اہتمام فقیر نے کیا ہے۔

آپ کی دعاؤں کا محتاج

والسلام

فقیر سید محمد ریاست علی قادری بریلوی

(۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگست ۱۹۸۲ء

محترم و مکرم جناب سید نور محمد القادری

السلام علیکم!

نوازش نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ "معارفِ رضا" انشاء اللہ العزیز دو تین ماہ میں منظرِ عام پر آجائے گا۔ "امام احمد رضا اور عالمِ اسلام" بھی تیار ہے، صرف چھپنا باقی ہے۔

اعلیٰ حضرت کی پسندیدہ نظم "چائے نامہ" آپ اپنی پہلی فرصت میں بھیج دیں ممکن ہے کہ موجودہ "معارفِ رضا" میں اس کو شامل کر لیا جائے۔ ورنہ معارفِ رضا حصۂ سوم میں تو انشاء اللہ العزیز چھپ ہی جائے گی۔

اُمید ہے مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔

والسلام

فقیر و حقیر سید محمد ریاست علی قادری

(۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۸، مارچ، ۱۹۸۳ء

محترم و مکرم جناب سید نور محمد قادری مد ظلہ

السلام علیکم!

بفضلہٖ تعالیٰ بخیریت ہوں۔ امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ "اقبال کے دینی اور سیاسی افکار"، نامی کتاب موصول ہوئی۔ پڑھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ اس پیش کش پر میری اور احباب کی طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ کتاب بہت اچھی اور معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے قلم کاروں کے لیے ایک علمی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہونا، نیز حنفی مسلک سے وابستگی اور اُن کی مذہبِ اسلام سے محبت نے کتاب کو اور زیادہ حُسن بخشا ہے۔

تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں آپ نے جس عمدگی سے ڈاکٹر سر محمد اقبال اور امام احمد رضا کی علماءِ ہند اور کانگریس سے منسلک نام نہاد علما اور دانشوروں سے بیزاری کا تذکرہ فرمایا ہے، وہ اہلِ پاکستان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ حسین احمد مدنی کا بڑی بے باکی اور دیانت داری سے پول کھولا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر وغیر ہم پر گاندھی کے اثرات کا خوب تجزیہ کیا ہے اور تاریخ ہند اور پاکستان کے صحیح حقائق پر جو پردے اب تک پڑے ہوئے تھے اُن کو چاک کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ جن پہلوؤں کی آپ نے نشان دہی کی ہے اُس پر محققین مزید کام کریں اور تحریکِ پاکستان کے اُن عظیم مجاہدین کی خدمات کا ذکر کریں جن پر علمائے دیوبند اور منکرینِ پاکستان نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ تحریکِ ترکِ موالات پر آپ کے مقالے کا منتظر ہوں [کیا یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے؟]، جس کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی اس موضوع پر پوری کتاب لکھی جانی چاہیے اور ڈاکٹر سر محمد اقبال اور اعلیٰ حضرت کا خاص طور پر ذکر ہونا چاہیے۔ یہ دونوں ہستیاں عشقِ رسول میں ڈوبی ہوئی تھیں، جس کا بین ثبوت اُن کے کلام سے ظاہر ہے اس پر بھی قلم اٹھائیں۔ شمس صاحب نے فقہ پر کتاب تقریباً آدھی سے زیادہ مکمل کرلی ہے۔ اس کے علاوہ ''امام احمد رضا اور عالمِ اسلام'' مولفّہ ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد آخری مراحل میں ہے۔ انشاء اللہ جلد منظرِ عام پر آجائے گی۔

اعلیٰ حضرت اور اقبال کے دینی اور سیاسی افکار میں ہم آہنگی سے متعلق ایک مضمون کی معارفِ رضا کے آئندہ شمارے کے لیے ابھی سے تیاری شروع کردیں یا جو مضمون آپ مناسب خیال کریں دو تین ماہ میں روانہ کردیں۔ والسلام

سید ریاست علی قادری

(۷)

۷۸۶
۹۲

۶، اگست، ۱۹۸۴ء

محترم و مکرم جناب سید نور محمد قادری صاحب مدظلہ العالی

سلام مسنون!

بفضلہٖ تعالیٰ بخیریت ہوں۔ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کی کتب آپ کو پسند آئیں۔ اس ہمّت افزائی کا شکریہ!

معارفِ رضا جلد ۴ کے لیے کوئی مضمون روانہ فرمائیں تاکہ اس سال کے مجلہ میں شائع ہوجائے۔

آپ نے ادارے کی کتب پر اظہارِ پسندیدگی فرمایا ہے، اس کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب کو آپ کے تاثرات سے آگاہ کردیا گیا ہے۔ وہ آپ کو سلام کہتے ہیں۔

پچھلے تین ماہ سے اندرونِ سندھ کے دورے پر تھا، اس لیے جواب تاخیر سے دے رہا ہوں، معذرت خواہ ہوں۔ فقط والسلام

ریاست علی قادری

(۸)

۷۸۶
۹۲

۶، اگست، ۱۹۸۴ء

محترم و مکرم جناب حضرت علامہ سید نور محمد قادری صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

بفضلہٖ تعالیٰ بخیریت ہوں بروز بدھ بتاریخ ۲۳ جنوری ۱۹۸۵ء بوقت چار بجے سہ پہر امام احمد رضا کانفرنس اسلام آباد ہوٹل اسلام آباد میں منعقد ہوگی، انشاء اللہ، شرکت فرمائیں۔ شکریہ

فقط

سیّد ریاست علی قادری

(۹)

۷۸۶
۹۲

۱۴، اپریل، ۱۹۸۷ء

محترم و مکرم جناب حضرت علامہ سید نور محمد قادری مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

بفضلہٖ تعالیٰ بخیریت ہوں۔ آپ کا خط موصول ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ جواب نہ دے سکا، معافی چاہتا ہوں۔ پچھلے دنوں دفتری اور گھریلو مسائل سے دوچار تھا۔ میں انشاء اللہ دو تین روز میں ''معارف رضا'' امام احمد رضا کی حاشیہ نگاری ''جدّالممتار علی الردالمحتار'' رہبر و رہنما'' بذریعہ بک پوسٹ بھیج رہا ہوں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مولانا سلیمان اشرف صاحب علیہ الرحمہ پر اپنی کتاب پوری کرلیں۔ اگر کتاب مکمل ہوجائے تو ہمارا ادارہ اس کتاب کو شائع کرسکتا ہے۔ آپ کوشش جاری رکھیں اور کتاب کو تین سو صفحات تک پہنچادیں۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا۔

اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ فقط وسلام

سید ریاست علی قادری

(۱۰)

۲۸، اپریل، ۱۹۸۷ء

محترم و مکرم جناب حضرت علامہ سید نور محمد قادری مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

کرم نامہ موصول ہوا۔ آپ نے ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کی مطبوعات پر پسندیدگی کا جو اظہار فرمایا، وہ ہمارے لیے باعث مسرت ہے جس سے ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں۔ آپ نے جو تجاویز دی ہیں وہ معقول ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی ہیں جن پر انشاء اللہ آئندہ توجہ دی جائے گی۔ ماہنامہ "معارفِ رضا" نکالنے کی تجویز بہت اچھی ہے، جس کے لیے ہم لوگ بھی غور و فکر کر رہے ہیں فی الحال مالی وسائل اتنے نہیں کہ اتنا بڑا کام شروع کیا جاسکے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ "معارفِ رضا" انشاءاللہ چھ سات ماہ بعد باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے گا۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ اس وقت ایک معیاری ماہنامہ جریدے کی سخت ضرورت ہے۔ آپ نے مندرجہ ذیل کتب کی فوری اشاعت کی طرف توجہ دلائی ہے:

۱۔ المحجۃ الموتمنۃ ۲۔ النور

تو ان دونوں کتابوں پر دیباچے لکھنا شروع کر دیں۔ ہمارے ادارے کی میٹنگ ہونے والی ہے۔ انشاء اللہ اس تجویز کو پیش کر دیا جائے گا۔ علامہ شمس بریلوی اور پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب سے بھی ذکر کیا جائے گا، تو کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

"السبیل" کے لیے میں انشاء اللہ تعالیٰ مولانا بہاری علیہ الرحمہ کے صاحبزادے اور دوسرے اصحاب کو لکھوں گا۔

آپ بہت جلد "دو قومی نظریہ کے دو عظیم مبلغ" مقالہ تیار کر کے بھیج دیں۔ انشاء اللہ معارفِ رضا کی زینت ہوگا۔

میری آپ سے گذارش ہے کہ اعلیٰ حضرت نے مغربی علوم سیکھنے کی کبھی مخالفت نہیں فرمائی، جس پر اُن کی وافر تصانیف موجود ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے سر سید احمد خاں کے علمی و سیاسی کاموں پر بھی کبھی تنقید نہیں فرمائی، بلکہ اعلیٰ حضرت تو سر سید احمد خاں کے نیچری خیالات اور اُن کے دینی و مذہبی فکر کے مخالف تھے۔ سر سید احمد خاں نے ایک دفعہ خود فرمایا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ علی گڑھ سے اس قسم کے لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے تو میں کبھی علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد نہ رکھتا۔

ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں بلاشبہ سر سید احمد خاں اور اعلیٰ حضرت دونوں کی بڑی خدمات ہیں جس کے لیے دونوں حضرات نے اپنے اپنے نکتۂ نگاہ سے کام کیا۔ وہ ایک دوسرے سے کہیں ٹکراؤ نہیں کھاتا۔ لہٰذا آپ کا یہ مقالہ علمی و سیاسی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ رہا سوال یہ کہ سر سید احمد خاں کے ساتھ اعلیٰ حضرت کا ذکر "معارفِ رضا" میں برداشت کیا جائے گا؟ تو عرض یہ ہے کہ گاندھی کا ذکر اعلیٰ حضرت کے ساتھ چل سکتا ہے جو مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا تو کیا وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ساتھ سر سید احمد خاں کا ذکر نہ ہو جنہوں نے اسلام کی خدمت میں اپنی پوری زندگی گزار دی۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اعلیٰ حضرت اور علامہ اقبال پر ایک مقالہ لکھیں: حُبِّ رسول ﷺ کے حوالے سے یا اقبال اور اعلیٰ حضرت کی عقیدت اولیائے عظام کے حوالے سے۔ میں نے آپ کا مضمون "علامہ اقبال کی عقیدتِ اولیائے عظام" سے پڑھا ہے۔ بہت پسند آیا کیا ہی اچھا ہو کہ آپ یا کوئی اور صاحبِ قلم اس طرف توجہ کرے کہ اقبال واقعی صحیح معنوں میں بریلوی مکتبۂ فکر کا ایک مضبوط ستون تھا۔

"علامہ اقبال بریلوی مکتبۂ فکر کا ایک مضبوط ستون"

آپ نے آخر میں لکھا ہے کہ خط طویل ہو گیا۔ دراصل پوچھیے تو آپ کا یہ طویل خط آپ کے تمام پچھلے مختصر خطوط کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ حوصلہ افزا دل نواز اور بہت اپنائیت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اقبال کا آخری معرکہ" کتاب مل گئی ہے، لیکن ابھی تک مطالعہ نہیں کیا۔ تاثرات بعد میں لکھوں گا۔

فقط والسلام

سیّد ریاست علی قادری

(۱۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

۳، جون، ۱۹۸۷ء

محترم و مکرم جناب حضرت علامہ سید نور محمد قادری صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

نوازش نامہ موصول ہوا۔ بفضلہٖ تعالیٰ بخیرت ہوں۔ "ایمانِ اقبال" نامی مضمون جو آپ نے تیار کیا ہے وہ کتنے صفحات پر مشتمل ہوگا تحریر فرمائیں۔ آپ اپنا مضمون "دو قومی نظریہ کے دو عظیم مبلغ" جلد تیار کر کے بھجوا دیں تاکہ "معارفِ رضا" میں شامل کر لیں۔

"سید احمد بریلوی کے فسانۂ جہاد کی حقیقت" اور "امام احمد رضا کی سیاسی بصیرت" کی تین تین کاپیاں اب تک نہیں ملیں۔ برائے کرم دوبارہ بھجوا دیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم "معارفِ رضا"

میں امام احمد رضا کی سیاسی بصیرت چھاپ دیں اگر آپ اجازت دیں۔
"سرورِ کونین ﷺ کی فصاحت" بہت جلد آپ کو روانہ کر دوں گا۔ شمس صاحب اور ڈاکٹر مسعود صاحب کو آپ کا سلام کہہ دیا ہے۔ دونوں حضرات بھی آپ کو سلام کہتے ہیں۔

والسلام
سیّد ریاست علی قادری

(۱۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

۶، جنوری، ۱۹۸۸ء

محترم و مکرم جناب علامہ سید نور محمد قادری صاحب مد ظلہ

"دو قومی نظریہ کے دو عظیم مبلغ" کا مسوّدہ موصول ہوا۔ ایک ہی نشست میں پورا رسالہ پڑھا۔ ماشاء اللہ بڑی محنت، جاں فشانی سے لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

اس مضمون کو یا تو "معارفِ رضا" ۱۹۸۸ء میں شامل کیا جائے گا یا پھر ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ حضرت علامہ شمس بریلوی کی کتاب "سرورِ کونین کی فصاحت" انشاء اللہ اگلے ہفتے روانہ کر دوں گا۔

آپ کی دعاؤں سے کراچی یونیورسٹی میں امام احمد رضا چیئر قائم ہو گئی ہے۔ اسی طرح پاکستان کی دوسری درس گاہوں میں بھی چیئرز قائم ہو جائیں تو بہت اچھا رہے گا۔ اپریل ۱۹۸۸ء میں "بین الاقوامی بہار شریعت کانفرنس" کا انعقاد انشاء اللہ تعالیٰ کراچی میں ہو گا۔ اگر آپ ایک مختصر مگر جامع مضمون بہارِ شریعت یا سید امجد علی صاحب اعظمی پر جلد روانہ فرما دیں تو بہارِ شریعت کے مجلہ کی زینت بن جائے گا۔ اس ماہ کے آخر میں اعلیٰ حضرت کی کتب اور اُن سے متعلق کتب کا ایک سیٹ انشاء اللہ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا سندھ چیف کورٹ کو پیش کر رہا ہے۔ جس میں چیف جسٹس سندھ مہمانِ خصوصی ہوں گے اور گورنر تابانی صدارت فرمائیں گے۔

باقی سب خیریت ہے۔

والسلام
سید ریاست علی قادری

(۱۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

۲۶، دسمبر ۱۹۸۸ء

محترم و مکرم جناب سیّد صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ اقدس! آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ آپ کے خط کے بعد واہ کینٹ سے جناب سیّد محمد عبداللہ قادری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ جائزے کی اصل حقیقت سے آگاہی ہوئی۔ کتاب "اقبال کا آخری معرکہ" بھی موصول ہو گئی جس کے لیے ممنون و شکر گزار ہوں۔ آپ کا مقالہ کراچی سے آ گیا ہے، اُس کی فوٹو کاپی انشاء اللہ سید محمد عبداللہ قادری صاحب کو دے دی جائے گی۔

"دو قومی نظریہ کے دو عظیم مبلغ انشاء اللہ اسلام آباد سے چھپوائی جائے گی۔ عبداللہ صاحب سے کہا ہے کہ وہ آپ کی سوانح لکھ کر دیں تاکہ کتاب میں شامل کر دی جائے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب سے مقدمہ با سخن ہائے گفتنی لکھوانے کی کوشش کی جائے گی۔ نظمِ اردو اور نظامِ اردو کی فوٹو کاپیاں ابھی تک نہیں ہوئی ہیں۔ انشاء اللہ جلد کرا کر جمیل جالبی صاحب کو پہنچا دی جائیں گی۔ غریب خانے پر آپ کی تشریف آوری میرے لیے باعثِ خوشی و باعثِ برکت ثابت ہوئی۔

فقط والسلام
سید ریاست علی قادری

(۱۴)

۶، فروری، ۱۹۸۹ء، اسلام آباد

محترم و مکرم جناب قبلہ حضرت علامہ سید نور محمد قادری صاحب مد ظلہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

نوازش نامہ موصول ہوا۔ انشاء اللہ تعالیٰ دو چار روز میں "دو قومی نظریہ کے دو عظیم مبلغ" کی مکمل فوٹو کاپی ارسال کر دوں گا۔ پورے ماہ بیمار رہا، ٹھنڈ لگ گئی تھی، کھانسی اور بلغم نے بہت تنگ کیا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے افاقہ ہے۔

نظمِ اردو اور نظامِ اردو کی فوٹو کاپیاں کرا لی ہیں۔ اس عرصے میں بیماری کی وجہ سے اور دوسرے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کچھ عرصہ باہر رہے ان کو نہ پہنچا سکا۔ پہلی فرصت میں پہنچا دوں گا۔ جیسے ہی کراچی سے ڈائریاں آئیں حکم کی تعمیل کروں گا۔ بچے سلام عرض کرتے ہیں۔ امید ہے آپ رو بصحت ہوں گے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے آپ کو سلام لکھا ہے۔

فقط والسلام
سید ریاست علی قادری

(۱۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۵مارچ۱۹۸۹ء

محترم جناب علامہ سید نور محمد قادری صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

نوازش نامہ موصول ہوا۔ نظام اردو اور نظم اردو کی فوٹو کاپیاں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو پہنچادی ہیں۔ کافی خوش ہوئے اور شکریہ ادا کیا "اکابرینِ دارالمصنفینِ اعظم کی تصوّف دشمنی" والا مضمون دو روز قبل پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب کو ٹھٹھہ بھجوادیا ہے۔ چونکہ معارف رضا ان ہی کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے، اس لیے مضمون ڈاکٹر صاحب جناب سید وجاہت رسول قادری صاحب کو کراچی بھجوادیں گے۔

آپ کی عنایت کردہ کتاب یعنی "اقبال کا آخری معرکہ" بھی ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو دے دی تھی۔

بچے سلام عرض کرتے ہیں۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

سید ریاست علی قادری

(۱۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام احمد رضا کانفرنس

مورخہ ۱۱/اکتوبر ۱۹۸۶ء بروز ہفتہ بوقت ۲ /۱ ۲ بجے دن

بمقام اسلام آباد ہوٹل، اسلام آباد

صدارت: الحاج حنیف طیب وفاقی وزیر پیٹرولیم وقدرتی وسائل

بہ تعاون: پیر خواجہ ابوالخیر محمد عبداللہ جان نقشبندی مجددی، دربارِ عالیہ مرشد آباد، پشاور۔ مفتی عبدالقیوم ہزاروی، ناظم اعلیٰ تنظیم المدارس پاکستان، لاہور۔

پروگرام: تلاوت قرآن کریم جناب قاری محمد یونس

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ جناب بشیر حسین ناظم

منقبت   جناب رئیس بدایونی

خطبۂ استقبالیہ   سید محمد ریاست علی قادری

مقالات: پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر سید مطلوب حسین، ڈاکٹر محمد طفیل، پروفیسر رحیم بخش شاہین، پروفیسر امتیاز احمد سعید، ڈاکٹر ابرار حسین، علامہ علی غضنفر کراروی، علامہ مفتی کفایت حسین نقوی، شاہ تراب الحق قادری، سید آل احمد رضوی۔

متمنیِ شرکت: سید محمد ریاست علی قادری، صوفی سعید انور نقشبندی الخیری

(۱۷)

ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا پاکستان اسلام آباد ملتمس ہے کہ آپ مجددِ دین وملّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہٗ کے ۶۹ ویں یومِ وصال کے موقع پر منعقد ہونے والی کانفرنس میں شامل ہوکر سعادت حاصل کریں۔

پروگرام انشاء اللہ

مورخہ: ۱۰/اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز پیر چار بجے شام

بمقام: اسلام آباد ہوٹل، اسلام آباد

صدارت: مولانا سیّد وصی مظہر ندوی، وفاقی وزیر مذہبی امور واقلیتی امور

مہمانانِ خصوصی: حاجی حنیف طیب صاحب، راجہ محمد ظفر الحق صاحب، مولانا کوثر نیازی صاحب۔

مقالہ نگار: پروفیسر پریشان خٹک، پروفیسر امتیاز احمد سعید، علامہ سید ریاض حسین شاہ، ڈاکٹر سید مطلوب حسین، سید آل احمد رضوی۔

چشم براہ: سید ریاست علی قادری، بانی وصدر، ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا

(۱۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امام احمد رضا کانفرنس

زیرِ صدارت: جناب محمود علی صاحب وفاقی وزیر برائے سماجی بہبود

مہمانِ خصوصی: مولانا کوثر نیازی صاحب

مجددِ دین وملّت امامِ اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ امام احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی وعلمی اور سیاسی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جید علما اور معروف دانشور اپنے خیالات پیش فرمائیں گے۔

آپ سے شرکت کی استدعا ہے کہ کانفرنس میں شرکت فرماکر ممنون فرمائیں۔

بمقام: اسلام آباد ہوٹل، اسلام آباد

بتاریخ: ۱۴، اکتوبر، ۱۹۹۰ء بروز اتوار بوقت ۳ بجے سہ پہر

منجانب: ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کراچی / اسلام آباد

ج، س، م، ف: سید ریاست علی قادری (بانی وصدر)

ابرِ گوہر بار ہے خامہ نرالہ آپ کا

صاحبزادہ سیّد وجاہت رسول قادری

(حضرت علامہ پیرزادہ محمد اقبال احمد فاروقی مدظلہ العالی کے حضور نذارنۂ عقیدت)

نکہتِ جاں بخش ہے مکتوب والا آپ کا
عارفانِ حق کو ہے مشکیں قبالہ آپ کا

رشتۂ آئینِ حق کردار والا آپ کا
پاسِ فرمانِ رسالت ہے حوالہ آپ کا

مشکبو باغِ رضا میں سرو و لالہ آپ کا
دائرہ نعمان[۱] میں ہے نام بالا آپ کا

آپ کی تحریر ہے تحریکِ علم و آگہی
دعوتِ تحقیقِ حق ہے ہر مقالّہ آپ کا

ہے اذانِ صبح گاہی آپ کی آواز میں
دعوتِ قبلہ نمائی ہے مصلّٰی آپ کا

حضرتِ احمد رضا کے ہیں نقیبِ خاص آپ
مشرق و مغرب میں چرچا، بول بالا آپ کا

مجلس[۲] و بزمِ رضا کے آپ ہیں روحِ رواں
گل سِتانِ رضویت میں پھول پھولا آپ کا

علم کے موتی ہیں گویا ہر سطر تحریر کی
ابرِ گوہر بار ہے خامہ نرالا آپ کا

سیفِ فاروقی کا مظہر آپ کا خطِّ قلم
ردِّ باطل خوب کرتا ہے رسالہ[۳] آپ کا

معنوی و صوروی خوبی کا حسنِ امتزاج
گنجۂ حسنِ معانی ہے قبالہ آپ کا

[۴]ہم دلاور[(۱)] ہیں، عبیدِ قادری[(۲)]، آپ ہیں مجید[(۳)]
آپ ہیں ماہِ رضا اور ہم ہیں ہالہ آپ کا

یہ فقیرِ قادری[(۴)] مع دست و بازوئے لطیف[(۵)]
ہم خیال و ہم نوا و ہم پیالہ آپ کا

اِک قلمدانِ ریاست[(۶)] آپ کے ہم اور ندیم[(۷)]
رقم کرتے ہیں اشارہ اور حوالہ آپ کا

قابلِ صد رشک ہے تابانی[(۸)] خُلقِ حسن[(۹)]
جس کو دیکھو جپ رہا ہے آج مالا آپ کا

کُل جہانِ رضویت میں ہیں مبشر[(۱۰)] حق کے ہم
کر رہے ہیں ہر طرف ارشاد بالا آپ کا

شعرِ تاباںؔ ہے کہ یک سر مدحِ احسانِ جناب
جو بھی سنتا ہے ہوا شیدا و والہ آپ کا

اشاریہ

۱۔ ادارۂ انجمنِ نعمانیہ، لاہور۔ ۲۔ مرکزی مجلسِ رضا، لاہور۔

۳۔ ماہنامہ ''جہانِ رضا'' لاہور۔ ۴۔ چار اشعار میں خط کشیدہ الفاظ ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا ٹرسٹ، کراچی کے اراکین کے اسمائے گرامی ہیں:

(۱) پروفیسر دلاور خاں نوری، جوائنٹ سیکرٹری۔ (۲) عبید الرحمٰن قادری، فائنانس سیکرٹری۔

(۳) پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری، جنرل سیکرٹری۔ (۴) فقیر سید وجاہت رسول قادری، صدر نشیں۔

(۵) حاجی عبد اللطیف قادری، رکنِ ٹرسٹ۔ (۶) سید ریاست رسول قادری، رکنِ ٹرسٹ۔

(۷) ندیم احمد ندیمؔ قادری نورانی، آفس سیکرٹری۔ (۸) حاجی عبد الرّزاق تابانی، رکنِ ٹرسٹ۔

(۹) ڈاکٹر محمد حسن امام، سیکرٹریِ اطّلاعات مطبوعات۔ (۱۰) مبشر خاں قادری (کمپیوٹر سیکشن)